قومی زبان

ماہ اپریل ۱۹۸۵ء

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ ۔ کراچی ۔ نمبر(۱)

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

اپریل ۱۹۸۵ء
جلد ۵۵
شمارہ ۴

مضمون نما

اداریہ		۳
اقبال (نظم)	مولانا حامد علی خاں	۵
ترکی میں مطالعۂ اقبال	ڈاکٹر حنیف فوق	۷
اقبال اور موریشس	عنایت حسین عیدن	۱۵
اقبال اور سر علی امام	صادق امام زیدی	۲۱
پیر حسام الدین راشدی	سحر انصاری	۲۵
وضع و استنادِ اصطلاحات	ڈاکٹر سید عبداللہ	۳۱
قومی زبان اور تعلیم	ڈاکٹر اسماعیل سعد	۳۷
جدید افسانہ	ڈاکٹر فہیم اعظمی	۴۵
غزل نما	ادا جعفری	۴۹
گلہائے رنگ رنگ		۱
گجرے	قلندر مہمند ترجمہ طاہر آفریدی	۵۵
شاہ جو رسالو	ڈاکٹر ہوتچند گربخشانی ترجمہ رحمت فرخ آبادی	۵۹
گیسو (نظم) ترکی	نیاز فتح پوری	۶۵
گوشۂ طلبہ		
علامہ اقبال	پروفیسر رفیع عالم	۶۷
زبانی و تحریری تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	
پیش رفت		۷۳
رفتارِ ادب	مبصرین	۷۹
گرد و پیش	نمائندے	۸۳
ردِ عمل	قارئین	۸۷
حروفِ تازہ	ادارہ	۸۹
نئے خزانے	ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری	۹۳

ادارۂ تحریر

قدرت اللہ شہاب
ادا جعفری
جمیل الدین عالی

مدیر معاون

ادیب سہیل

قیمت ۵ روپے

بدل اشتراک

فی پرچہ ۔۔۔۔۔۔ ۵ روپے
سالانہ ۔۔۔۔۔۔ ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۰ روپے

بیرونِ ملک

فی پرچہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۰ روپے
سالانہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ۔۔۔۔۔۔ ۱۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱ فون: ۲۱۷۱۳۷

اداریہ

علامہ اقبالؒ اس مہینے میں ۴۷ برس پہلے ہم سے جدا ہوئے تھے۔ اسی باعث ہماری نظر میں ماہ اپریل کا ایک الگ تشخص اور احترام قائم ہو گیا ہے۔ اس موقع پر ملک بھر میں اخبارات و رسائل خاص اشاعت کا اجراء کرتے ہیں، ادبی و ثقافتی انجمنیں علامہ کی یاد کو ان کی قومی و ملّی خدمات اور ادبی و شعری تخلیقات کے ذریعے دہراتے ہیں۔ ان کی طرف سے علامہ کے فن و شخصیت، حکیمانہ خیال و اقوال اور ان کے فلسفۂ حیات کے تازہ بہ تازہ گوشوں پر مذاکرات کا اہتمام کیا جاتا ہے، کتابچے اور کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہم علامہ کے فلسفۂ زندگی اور فکر و شعر کی تفہیم میں نئی نئی جہات سے روشناس ہوتے ہیں۔

علامہ کے فکر و فلسفہ اور شاعری میں آفاقیت و عظمت کے موضوع پر بہت لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ دراصل علامہ کسی ایک عصر کے فلسفی و شاعر نہیں، ان کی فکری و شعری ذات میں بہ یک وقت تینوں زمانے ماضی حال مستقبل سفر کرتے ہوئے اور سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اس اہم موقع پر "قومی زبان" کے صفحات میں ہم نے بھی اس بات کے لیے اپنی سی کوشش کی ہے کہ علامہ سے متعلق کوئی نیا گوشہ اُجاگر ہو۔ چنانچہ اس بار اس محفل میں موریشس کے ایک ادیب جناب عنایت حسین عیدن کا مرسلہ مضمون "اقبال اور موریشس" شامل کیا گیا ہے۔ اس مضمون کی علمی حیثیت سے قطع نظر ایک اہمیت یہ ہے کہ اس سے نہ صرف موریشس میں اقبال سے وہاں کے لوگوں کی عقیدت و محبت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان حضرات کی اردو سے وابستگی کا بھی سراغ ملتا ہے۔

پیر حسام الدین راشدی کا شمار انجمن کے محسنوں میں (نائب صدر) ہے۔ وہ بھی ہم سے اسی مہینے میں جدا ہوئے۔ یہ ان کی تیسری برسی کا موقع ہے۔ ایسے میں ان کی یاد کا آنا لابدی تھا۔ چنانچہ ایک مضمون کے ذریعے پیر صاحب کی یاد کے اس تسلسل کو قائم رکھا گیا ہے۔ یہ ایک حقیر سی سعی ہے۔ پیر صاحب تحقیق میں ایک عالمانہ شان رکھتے تھے۔ اور علم و حلم اُن کا سرمایۂ حیات تھا۔

پاکستان میں اس مہینے جرمنی کے مشہور مستشرق ارنسٹ ٹرمپ کے سلسلے میں صد سالہ تقریبات (۱۸۲۸ء-۱۹۰۹ء) کا انعقاد ہوا جنھوں نے سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی کتاب "شاہ جو رسالو" کو سب سے پہلے دریافت کر کے مدوّن کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اردو ادب میں جو حیثیت اسپرنگر کی ہے وہی مقام سندھی ادب میں ٹرمپ کو حاصل ہے۔

(ادارہ)

اقبالؒ

مولانا حامد علی خاں

جنھیں رفعت سے آنکھیں بھی ملانے کا نہ تھا یارا
انھیں پھر لے اڑی یہ کس کی تخئیلِ سپہر آرا

گرے میراثِ آبا کھو کے یوں ہم خاکِ حسرت پر
کہ تھا دنیا کی آنکھوں کے لیے عبرت یہ نظّارا

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر کر، کہ پھر کیوں کر
جبینِ چرخ پر چمکے ترا ٹوٹا ہوا تارا ؟

گداؤں کو جہاں بانی سکھانے کے لیے کس نے
خزانہ حکمتِ گم گشتہ کا پھر پا لیا سارا ؟

ہوئے افراد پھر احیائے ملّت کے لیے قرباں
کیا کس کی حق آگاہی نے دردِ قوم کا چارا ؟

درآیا پھر قشونِ عشق یغمائے دل و جاں کو
ہوس کے قافلے کو لے کے بھاگا نفسِ امّارا

نقیبِ آفتابِ تازہ و تابندہ تر آیا
کہ ابھرا ہے افق سے پھر ترا ڈوبا ہوا تارا

فلک سے جا ملا پھر بُرجِ قصرِ سطوتِ کبریٰ
ترا اقبال ہے اور ملّتِ بیضا کا نقّارا

بنایا اپنے دل کو گنجِ اِسرارِ لقا جس نے
اور اُس کو اُمّتِ مرحوم کی تقدیر پر وارا

سُرورِ سینۂ ملّت، فروغِ دیدۂ دنیا
خدائے پاک کا پیارا، نبیؐ کی آنکھ کا تارا

نواسازِ خودی! تیری نوا کی گونج اٹھی ہی تھی
کہ ٹھکرانے لگے پھر بے نوا تاجِ سرِ دارا

تری بانگِ درا پر کارواں پھر جادہ پیما ہے
کیا پھر تو نے بختِ خُفتہ کے ثابت کو سیّارا

ترے ذوقِ یقیں نے کارفرمائے جہاں پائے
وہی دل، دیدۂ نکبت نے پایا جن کو ناکارا

ریاضِ ہند[1] کو تو نے لہو رو رو کے سینچا ہے
ادا تو نے کیا ملّت کی ہر غفلت کا کفّارا

گیا ہر باغِ ملّت میں شمیمِ جانفزا لے کر
ترا جوشِ اخوّت اور صبا کا خیلِ آوارا

ترے سوزِ محبّت کی فسوں سازی نے پگھلائے
وہ بے حس دل، کہ تھے قرنوں سے سنگِ سمۂ خارا

---

[1] یہ نظم ۱۹۳۲ء میں ماہنامہ نیرنگِ خیال لاہور کے اقبال نمبر میں چھپی تھی۔ علامہ کے فن و شخصیت پر یہ سب سے پہلا نمبر تھا اور ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا۔

ترکی میں مُطالعۂ اقبال

ڈاکٹر حنیف فوق

اقبال کے متعلق جدید ترکی کے سب سے اہم شاعر محمد عاکف کا خط جو اس مقالے میں شامل ہے نہایت اہم دستاویز ہے۔ ایک بڑے شاعر نے دوسرے بڑے شاعر کو جس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے نہ صرف وہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس سے ترکی اور پاکستان کے قریبی تہذیبی رابطوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اینے میری شیمل جو اقبالیات کے سلسلے میں دنیا میں معروف ہو چکی ہیں، ان کے "جاوید نامہ" کے ترکی ترجمے اور تشریح کا حوالہ بھی اس مقالے میں موجود ہے۔ امید ہے کہ اقبالیات کے سلسلے میں یہ مقالہ مفید ثابت ہوگا۔

انیسویں صدی کے آغاز سے مغرب کی استعماری قوتیں جنوبی مشرقی ایشیا تک پھیل چکی تھیں۔ صنعتی اور تکنیکی طور پر ایک برتر نظام نے انھیں مشرق کے پس ماندہ ملکوں کو اپنا محکوم بنانے میں مدد دی تھی۔ جہاں برصغیر ہند و پاک پر برطانوی استعمار اپنی گرفت براہِ راست مضبوط کر چکا تھا۔ وہاں تین براعظموں میں پھیلی ہوئی سلطنتِ عثمانیہ بھی یورپی استعماری طاقتوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رہی تھی ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک کی آزادی سلب ہوتی جا رہی تھی اور ترکی و ایران بھی مغربی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو کر اپنی حاکمیت برقرار رکھتے ہوئے بھی آزادانہ عمل کی قوت کھوتے جا رہے تھے۔ یورپ کے مردِ بیمار یعنی ترکی کے حصے بخرے ہو رہے تھے۔ مشرق اور خاص طور پر عالمِ اسلام یورپی استعمار کے پھیلاؤ سے جس کشمکش میں مبتلا تھا اس نے سوچنے والے ذہنوں کو شدید طور پر متاثر کیا تھا۔ چنانچہ مغرب اور مشرق کی سیاسی و تمدنی کشمکش کے ساتھ ساتھ ذہنی تصادم کی جو صورتیں رونما ہو رہی تھیں، ان کے پس منظر میں علمی و انقلابی شخصیتیں اُبھر رہی

تھیں۔ جن کا مطمحِ نظر ایک جانب اس ذہنی جمود کا سدِّباب تھا جو نظامِ پیداوار کے اعتبار سے پس ماندہ ملکوں کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ اور دوسری جانب مغرب کے سیاسی استبداد کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ مغربی فکر کی ذہنی غلامی سے مدافعت کی حریفانہ و حلیفانہ فکری صورتیں بھی اس مطمحِ نظر کا ایک اہم جزو تھیں۔

مشرق میں مشترک ابتلا کے پیشِ نظر عصری فکر کے مختلف گوشوں میں مشابہت ملتی ہے۔ خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں اور ترکوں میں فکری اور تہذیبی لین دین کی تاریخی روایات کی موجودگی میں ایک ملک کے افکار دوسرے ملک میں برابر اثر انداز ہوتے رہے۔ اور ایک ملک کے کرب و ابتلا میں دوسرے ملک کے مسلمان اضطرابی طور پر شریک رہے ہیں۔ اسلام اور مغرب کو دو متحارب قوتوں کے طور پر پیش کرنے میں جمال الدین افغانی کا بڑا حصہ ہے۔ اور اس کے افکار سے برصغیر کے مسلمان اور ترک دونوں ہی متاثر ہوئے ہیں۔ جمال الدین افغانی کے ساتھ اسلامی دنیا کے مفکروں میں شیخ محمد عبدہ، ضیا گوکلپ، امیر علی، سرسیّد، شبلی، نامق کمال، ابوالکلام آزاد، سعید حلیم پاشا، طٰہٰ حسین، حالی، عبدالحق حمید، ابراہیم شناسی، توفیق فکرت، محمد عاکف اور اقبال کسی نہ کسی عنوان سے مغربی تہذیب کے فکری سیلاب کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ ان مفکرین میں مغربی فکر کے ردّ و قبول کے مختلف مدارج ملتے ہیں لیکن جو بات سب میں مشترک ہے وہ یہ کہ اسلامی ممالک کی فکری حرکت کو مغرب کا ہم پلّہ بنایا جائے۔ مغربی فکر کو رد کرنے والوں نے بھی اس فکر کے ایک حصہ کو قبول کیا ہے اور قبول کرنے والوں کی غایت بھی تقلید نہیں فکری احیا ہے۔ چنانچہ ان کی فکری کاوشوں سے ذہنی اور سیاسی حرّیت کی بہت سی راہیں روشن ہوئی ہیں اور جوانانِ ترک کی تحریک ہو یا تحریکِ خلافت، اپنے معین حدود کے باوجود ان سے خود بخود جدید انقلابی فکر کے شرارے پھوٹے ہیں۔

ترکی اور برصغیر کے مسلمانوں کے تہذیبی اور فکری روابط کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی کے افکار اور سلسلۂ طریقت سے برصغیر کے مسلمانوں اور شیخ احمد سرہندی کے افکار اور طریقۂ نقش بندیہ مجدّدیہ سے ترکی کے مسلمانوں کے متاثر ہونے کی روایت جدید دور میں بھی استوار ہوتی رہی ہے جس کی ایک درخشاں مثال شبلی ہیں۔ کہ ان کی کتابوں کے ترکی میں کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ امیر علی کی "دی اسپرٹ آف اسلام" کا ملخص ترجمہ عمر رضا نے استنبول سے "روح الاسلام" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اقبال سے ترکی اور برصغیر کے فکری رشتے زیادہ مضبوط ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ بیک وقت ترکی اور برصغیر کی اسلامی روایات کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال نے اپنی کتاب "اسلام میں مذہبی خیالات کی تشکیلِ نو ..... (THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) میں سعید حلیم پاشا کی کتاب سے (جس کا ترجمہ فرانسیسی سے ترکی میں محمد عاکف نے "اسلام لاشمک" کے عنوان سے کیا ہے) اقتباسات پیش کیے ہیں۔ "جاوید نامہ" میں بھی سعید حلیم پاشا کی زبان سے شرق و غرب کی کشمکش کا بیان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے یہاں ضیا گوکلپ اور محمد عاکف کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ اقبال ترکی کے ملّی مستقبل کے لیے ہمیشہ پُرامید رہے اور اپنے آتشیں اشعار میں نہ صرف کمال اتاترک کی مدح کی بلکہ جگہ جگہ ترکی کے ماضی، حال و استقبال کے لافانی نقوش ابھارے ہیں۔

دراصل اقبال بھی برصغیر کے مسلمانوں کی ترک دوستی کے سلسلے کی، جس میں اس دور کے تقریباً تمام اردو مصنفین و شاعر شامل ہیں، ایک زرّیں کڑی ہیں۔ ترکی سے اس محبت اور خود اقبال کی فکری عظمت کے سبب سے ترکی میں اقبال شناسی کا سلسلہ

خودان کے زمانے سے قائم ہوگیا تھا۔ ولفریڈ کینٹویل اسمتھ (WILFRED CANTWELL SMITH) کو جدید ترکی سے اقبال ناشناسی کی شکایت ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "بہت سے ترکوں کے ہونٹوں سے لوتھر کا نام سننا یقیناً حیرت انگیز ہے، جبکہ وہ مشکل ہی سے الاشعری، الغزالی اور اقبال کی تخلیقات کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں۔" یقیناً اقبال اپنے فکری مرتبہ کے اعتبار سے ماضی و حال کے اسلامی مفکرین کے صفِ اوّل میں آتے ہیں۔ لیکن ترکوں سے اقبال ناشناسی کی یہ شکایت صحیح نہیں ہے۔ اس کا جواب سطورِ آیندہ میں موجود ہے۔

اقبال کو اوّل خراجِ تحسین خودان کے معاصر اور ترکی کے دورِ انقلاب کے سب سے بڑے شاعر و مفکر محمد عاکف نے پیش کیا تھا۔ محمد عاکف ترکی کے نہایت گرامی قدر شاعر ہیں اور جدید ترکی کا ملّی ترانہ ان ہی کی تصنیفِ لطیف ہے۔ محمد عاکف ترکی کی مسلم مفکر کی نشاۃ ثانیہ کے نقیبوں میں ہیں اور ان کی شاعری نے اپنے زمانے کی ملّی جد وجہد کے بہت سے خطوط روشن کیے ہیں۔

محمد عاکف نے اپنے مجموعہ "صفحات"، جو سات کتابوں پر مشتمل ہے، اقبال کی نذر کیا تھا۔ محمد عاکف اور اقبال دونوں ایک دوسرے کے شعری تخلیقات سے باخبر تھے۔ محمد عاکف نے ۱۹۲۵ء میں حافظ عاصم کو مصر سے ایک خط میں اقبال کے بارے میں یہ کلمات لکھے تھے: "گذشتہ ہفتہ مجھے ہند کے اسلامی شاعر محمد اقبال کی دو منظوم کتابیں بھیجی گئیں۔ میں نے اس شاعر کی ایک مختصر شاعرانہ تخلیق انقرہ میں دیکھی تھی اور صاحبِ تخلیق کو اپنے آپ سے مشابہ قرار دیا تھا۔ مشرق میں پروان چڑھنے والے صوفیا و عرفا کی تمام تحریریں پڑھنے کے علاوہ جرمنی جا کر مغربی فلسفے کو پوری طرح ہضم کرنے والا اقبال حقیقتاً ایک عظیم شاعر ہے۔ ہند کے مسلمانوں میں اقبال کا نام نہ جاننے والا اور ان کے اشعار ازبر نہ کرنے والا در اصل کوئی نہ ملے گا۔ ان کا اردو میں شعر لکھنا فطری امر ہے۔ تاہم میں نے جو دیکھا وہ ان کا فارسی کلام ہے۔ مولانا کو خوب پڑھا ہے، ان سے بڑی محبت ہے۔ انھیں اپنا مرشد کہتے ہیں۔ ان کی ان دو منظوم کتابوں میں ایک "پیامِ مشرق" ہے۔ رباعیوں کے ساتھ بڑی نفیس غزلیں ہیں۔ بعض غزلوں نے مجھے نعرۂ وجد لگانے کی حد تک مست کر دیا۔ اقبال کی عربی دانی بھی پُر قوت ہے۔ ان کے علم و عرفان اور شاعرانہ قدرت کا میری صلاحیتوں اور شاعرانہ قدرت سے قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بے حد فصیح ہے لیکن ان کی قوتِ فارسی گوئی میرے ترکی کے تصرف سے کچھ کم ہے۔ اگر حضرت کا اسلوب بھی نیا ہوتا تو فارسی ادب میں قیامت آجاتی۔" (حافظ عاصم کے نام خط ۸-۳-۱۳۴۱ھ — محمد عاکف از اشرف ادیب صفحہ ۱۴۳) ایک معاصر نے دوسرے معاصر کو جن لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ شخصی عظمت اور بلند نظری کی روشن دلیل ہے۔

محمد عاکف کی اقبال سے عقیدت کا سلسلہ دور تک پہنچا ہے اور چراغ سے چراغ روشن ہوتے جاتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر علی نہاد تارلان بھی اقبال کے شیدائیوں میں معروف مقام رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اقبال کا نام انھوں نے برسوں پہلے محمد عاکف کے عزیز دوست اور اپنے استاد فرید کام (FERID KAM) سے سنا تھا کہ وہ اقبال کو موجودہ دور میں مشرق کا سب سے معظم مفکر اور شاعر شمار کرتے تھے۔ یہ پاکستان کے قیام سے پہلے کی بات ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد ڈاکٹر علی نہاد تارلان کو اقبال سے زیادہ واقفیت کا موقع ملا اور اقبال سے ان کی شیفتگی بڑھتی گئی۔ اقبال کو ترکی میں روشناس کرنے والوں میں پروفیسر علی نہاد تارلان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ علی نہاد تارلان نے "اسرارِ خودی" کا ۱۹۵۵ء میں ترکی میں ترجمہ کیا (بنی لک بر ہم ایلوی استنبول صفحات ۹۰) اس کے دیباچے میں اقبال کی حیات و شعری خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ پاکستان ہماری مصیبتوں اور مسرتوں میں دل سے شریک ہونے والی اسلامی مملکت ہے۔ "رموزِ بے خودی" کا ترجمہ بھی ساتھ ہی شائع ہوا۔ اس کی دوسری اشاعت کچھ اضافے

کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں ہوئی (بدر یاینئن ایوی، استنبول صفحات ۱۴۰) اس کے دیباچے میں علی نہاد تارلان نے اقبال کی حیات اور معنوی فردیت سے بحث کی ہے۔ ان کے علاوہ علی نہاد تارلان کے اقبال سے تراجم مندرجہ ذیل ہیں۔ ضربِ کلیم (استنبول مطبع سی صفحات ۶۴- ۱۹۶۸ء، ارمغانِ حجاز (استنبول مطبع سی ۱۹۶۸ء صفحات ۶۱) یہ منتخب اشعار کے ترجمے ہیں۔ ارمغانِ حجاز کے دیباچے میں علی نہاد تارلان۔ اسلامی دنیا کا مغربی فکر کو سب سے بلیغ جواب اقبال کو بتاتے ہوئے انھیں مغرب کے لیے بھی ایک روشن مشعل قرار دیتے ہیں۔ علی نہاد تارلان کے یہ ترکی ترجمے منتخب حصّوں کا ترجمہ ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ غیر ترجمہ شدہ حصّے کم ہیں۔ علی نہاد تارلان کے پیامِ مشرق کے بعض منتخب حصّوں کا ترجمہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ (احمد سعید مطبع سی، استنبول صفحات ۱۳۰) ان کے دیباچے میں اقبال کی حیات و تصانیف سے بحث کی گئی ہے۔ جدید گلشنِ راز کا ترجمہ (مترجم علی نہاد تارلان) ۱۹۵۹ء میں (کاروانِ مطبع سی استنبول، صفحات ۳۱) شائع ہوا۔ اور زبورِ عجم کے منتخبات کا ترجمہ (احمد سعید مطبع سی استنبول صفحات ۴۶) ۱۹۶۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پیامِ مشرق اور زبورِ عجم دونوں کے منتخب حصّوں کا ترجمہ "اقبال دان شعرلار" کے نام سے ۱۹۷۱ء میں (ترکیے اش بنکاسی کلتر یاینئن لاری، صفحات ۲۸۲) شائع ہوا۔ اس کے مقدمے میں اقبال کے فکر کی تحلیل کرتے ہوئے علی نہاد تارلان نے خاص طور پر مثبت علم، سوشیالوجی، وطن پروری، شعر و ادبیات اور تصوف سے بحث کی ہے۔ اس کتاب میں پیامِ مشرق سے امان اللہ خاں سے خطاب، لالۂ طور کی رباعیات "فکر لز" کے عنوان سے منتخب نظموں کے ترجمے "شراب باقی" کے تحت منتخب غزلوں کے ترجمے، روحِ عرب اور زبورِ عجم کے منتخب اشعار شامل ہیں۔ علی نہاد تارلان کا شمار ترکی میں اقبال کے عالموں میں ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "پاکستان کے عظیم ملّی شاعر اقبال کو ترکی کے منور جوار میں روشناس کرنا میری زندگی کے شمار کیے جانے والے مظاہر میں سے ایک ہے۔" ان خدمات کی وجہ سے پاکستانی حکومت کی طرف سے پروفیسر علی نہاد تارلان کو ۱۹۶۰ء میں "نشانِ پاکستان" سے نوازا جا چکا ہے۔

ترکی کے ملّی شاعر محمد عاکف کے ذریعہ ترکی کے ممتاز ادیب اسماعیل حبیب سیووک (ISMAIL HABIB SEVUK) بھی اقبال سے واقف ہوئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "پاکستان کے ملّی، ساتھ ہی ساتھ انسانی اور فیلسوفِ تصوریت غرض ہر معنوں میں عظیم اقبال سے واقفیت پہلے پہل بہ زمانۂ جہدِ استقلال ۱۹۲۲ء کے موسمِ بہار میں ہمارے شاعر مرحوم محمد عاکف کے ذریعہ کہ وہ اس زمانے میں انقرہ کے تاج الدین درگاہ میں اقامت پذیر تھے، ہوئی اور ان کی صحبتوں میں سب سے اوّل ان کا نام سنا اور ان سے واقف ہوا۔" اسماعیل حبیب سیووک نے محمد عاکف کے کلام کے بعض حصوں کا اقبال کے "شکوہ" سے موازنہ کیا ہے اور اپنے مقالہ "اقبال اور ہم" (۱۹۵۳ء) میں خاص طور پر اقبال کے کلام کے ان حصوں کا جائزہ لیا ہے جو ترکی سے متعلق ہیں۔

اقبال کے "جاوید نامہ" کا ترکی میں ترجمہ علیحدہ علیحدہ سنان اوغلو، حامد یاوار اوغلو اور فریدون تیمور کی جانب سے ہوا۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم ترکی میں شرح اور ترجمہ ڈاکٹر این میری شیمل (ANNE MARIE SHIMMEL) کا مرہونِ منت ہے۔ ایک زمانہ تک انقرہ یونیورسٹی کی الٰہیات فیکلٹی میں استاد رہی تھیں۔ "جاوید نامہ" کے نام سے ان کی یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں (ترک تاریخ کرمو، با اسم ایوی) شائع ہوئی۔ اس کے پیش لفظ میں وہ لکھتی ہیں کہ "مغربی مدنیت، علم اور تکنیک کا نفوذ ہندستان سے شروع ہو کر مراکش تک جا پہنچا۔ ہندستان، مصر اور ترکی میں اس نے مختلف اجتماعی اور قانونی اصلاحوں کی راہیں کھولیں۔" اقبال کے فکری نشو و نما اور خصوصاً جاوید نامہ میں ان کے سفر سے بحث کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ "اقبال کے اس پُر آرزو اور آتشیں

سفر کا اختتام اور اس کے معنوی معراج صرف اللہ کے حضور میں ہوتی ہے۔" ڈاکٹر این میری شیمل نے اقبال اور محمد عاکف کے یہاں بعض مشترک و مشابہ موضوعات کی نشاندہی بھی کی ہے ــــ ڈاکٹر این میری شیمل کی کتاب میں اقبال کے فکری پس منظر کو پیش کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ یہ کتاب ترکی میں اقبال کی تفہیم کے لیے نہایت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ خصوصاً جاوید نامہ کی شرح جس عالمانہ انداز سے لکھی گئی ہے۔ اس نے ترکی میں اقبال کی فکر کے بہت سے گوشوں کو روشن کر دیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر علی نہاد تارلان کے بعد اور ان کے ساتھ ساتھ پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر کراحان بھی اقبال کی تعارفی مجلسوں میں شریک رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب "ڈاکٹر محمد اقبال دے اثر لر ندین سیچمے لر" (ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کی تصانیف سے منتخبات) شائع ہوئی ہے (استنبول گنج لِک باسم ایوی ۱۹۷۴ء۔ ترکی جمہوریت کے پچاسویں سال میں سینٹو کی جانب سے صفحات ۲۳۱) اس کے دیباچے میں وہ اقبال کے متعلق لکھتے ہیں: "صرف سرزمین پاکستان کے لیے نہیں، ساتھ ہی ساتھ آزادی، وطن پرستی، فضیلت کے لیے کوشاں تمام مسلمانوں اور انسانوں کی خدمت کرنے والے مفکر شاعر اقبال ہیں۔" اس کتاب کے مقدمے میں ترکی، ایران اور پاکستان کے تہذیبی روابط کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر اقبال کی ادبی انفرادیت و صنعت اور ان کے دنیا و زندگی کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ ترجموں میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے مختصر پارے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اقبال کی کتاب "دی ریکنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ اِن اسلام" سے "علم اور مذہبی تجربہ"۔ "مسلم تہذیب کی روح" کے ساتھ ساتھ اقبال کے قائداعظم کے نام بعض خطوط بھی ترجمے کیے گئے ہیں۔ اصل متن کے اردو، فارسی اور انگریزی میں شامل کر دینے سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

ان کے علاوہ ترکی میں اقبال سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں میں ایک اہم کتابچہ "رومی اور اقبال" کے نام سے پاکستانی سفارت کی جانب سے اشاعت پذیر ہوا (ماڈرن ترکیے باسم ایوی، انقرہ ۱۹۵۲ء صفحات ۲۰۷) اس کتابچہ میں اس وقت کے پاکستانی سفیر میاں بشیر احمد کی انقرہ یونیورسٹی "دل تاریخ، جغرافیہ فیکلٹی کے جلسوں کی سخن رانیاں شامل ہیں۔ (۱) مولانا روم کی حیات اور پاکستان کے ملّی شاعر محمد اقبال پر اس کی تاثیر (۱۹۵۰ء) (۲) اقبال کی حیات و فکر (دسمبر ۱۹۵۰ء) (۳) رومی و اقبال (۴) اقبال کا پیغام (اپریل ۱۹۵۱ء) ان موضوعات کے علاوہ اس کتابچے میں اس وقت کے قونیہ سے ملّی نمایندے اور ترک پاکستان کلچر جمعیت کے صدر عمر رضا دوغرول (OMER RIZA DOGRUL) کی انقرہ یونیورسٹی میں ۱۹۵۱ء میں کی ہوئی اقبال سے متعلق تقریر کے ساتھ مندرجہ ذیل تحریریں بھی شامل ہیں۔

(۱) نورالدین ارتام۔ شاعر ڈاکٹر اقبال (۲) پاکستان کا عظیم شاعروں مفکر محمد اقبال سہا ثاقب تانر (SUHA SAKIB TANER) (۳) مولانا رومی اور شاعر اقبال زیریا کرادنیز۔ (ZERIA KARADENIZ) (۴) مولانا جلال الدین رومی۔ احسان ادا (IHSAN ADA) بے شبہ ترکی میں اقبالیات کے سلسلے کی یہ ایک مفید کڑی ہے۔

اس نوع کا ایک اور کتابچہ "ترکیے دے ڈاکٹر محمد اقبال" (ترکی میں ڈاکٹر محمد اقبال) استنبول سے شائع ہوا ہے (سرالار مطبع سی ۱۹۶۲ء صفحات ۵۲) اس میں علی نہاد تارلان کی تحریر "اقبال"، پروفیسر فاخر از (FAHIR IZ) کی۔ اقبال کی حیات و

"شخصیت"، علی نہاد تارلان کی "زبورِ عجم سے ایک پارہ"، کمال ادیب کر کچو اوغلو۔ (KEMAL EDIP KUR KCUOGLU) کی "اقبال سے متعلق"، کاظم اسماعیل گرکان (KAZIM ISMAIL GURKAN) کی اقبال اور پاکستان" شریف الحسن کی "اقبال و رومی"، ڈاکٹر ترک کایا عطاؤد (DR. TURK KAYA ATAOV) کی اقبال کی حقیقی تصوّراتی فکر کے عنوان کی تحریریں شامل ہیں۔ ظفر حسن ایبک کی تحریر "پاکستان کے ملّی شاعر و فیلسوف محمد اقبال"، ڈاکٹر محمد صابر کا ترجمہ طلوعِ اسلام اور شگوفہ نہال کی ترکی نظم "عظیم اقبال"، بھی اس کتاب کی زینت ہیں۔ کاظم اسماعیل گرکان کی تحریر "اقبال و پاکستان" سے دو اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

> "پہلی جنگِ عالمگیر کے اختتام پر پارچہ پارچہ ہونے والی عثمانی سلطنت کے خاص مادہ اصلی ترکوں ۔ ن کے مادرِ وطن میں اپنے کفِ دست میں لے کر ان سے جدید ترکی کی بنیاد رکھنے کے لیے جہاد آزما مصطفٰی کمال اور ان کے دوستوں کو سب سے اوّل سننے والے اور ان سے امید باندھنے والے برصغیر ہند کے مسلمان تھے۔"
>
> "ترکوں کے سیاہ دنوں میں، ساری دنیا کی ترکوں کے وجود سے امیدیں منقطع کر دینے کے وقت ہماری تاریخ کی اساس کو جانتے ہوئے ترکوں کی جسارت کے شیفتہ ہونے ہوئے ان پر اعتماد رکھتے ہوئے اس یقین کو اپنی ملّت تک پہنچانے والے پاکستان کے عظیم ملّی شاعر اور مفکر اقبال ہیں۔"

یہ کتابچہ مختصر ہوتے ہوئے بھی اقبال، ترکی اور پاکستان کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح کی مختصر کتابوں میں ایک مفید کتاب صلاح الدین ساوجی (SELAHADDIN SAVCI) کی، پاکستان کی زبان اور ادبیات (PAKISTAN DILVE EDEBIYATI) بھی ہے۔ (فاتح مطبع سی استنبول سنہ ۱۹۶۶ء صفحات ۱۱۲) اس میں اردو زبان کی نشوونما، اردو اور پاکستان کے مصنفوں اور شاعروں (شاہ عبداللطیف بھٹائی، نذرالاسلام) کے علاوہ سب سے طویل حصہ اقبال سے متعلق ہے۔ اقبال پر ایک مختصر باب کے بعد ان کے فکری سرچشموں اور پھر ان کی منظومات جاوید نامہ اور دیگر منظومات کا جائزہ لیا گیا ہے اور منتخب ترجمے پیش کیے گئے ہیں۔ اقبال کے متعلق دوسروں کے ...یروں سے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اور یہ اقتباسات مفید ہیں۔ مثلاً:

"اقبال۔ نامق کمال اور محمد عاکف کی نسل سے منسوب ایک صنعت کار ہیں۔" (علی نہاد تارلان) "اقبال نے خدا کی ودیعت کی ہوئی صلاحیت کے بعد مولانا سے قوی ترین فیض اٹھایا۔ ان کی مولانا سے وابستگی ہمیں بھی ان سے وابستہ کرتی ہے۔ اقبال سنہ ۱۹۲۲ء کی ظفرِ عظیم کے بعد "طلوعِ اسلام"، کے اشعار لکھ کر اتاترک سے بھی وابستہ ہوئے۔ اتاترک کو مولانا سے جو ربط تھا اس کا ہیں اس ظفرِ عظیم کے چھ سال بعد شاہد ہوا۔" (اسماعیل حبیب سیووک)

اقبال کی فکر سے متعلق بھی ترکی میں ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ ان کی کتاب "دی ریکنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام"، کا ترجمہ پارہ پارہ مرحوم عمر رضا دوغرول کی جانب سے "سلامت"، نام کے استنبول سے نکلنے والے پندرہ روزہ اخبار

میں شائع ہونا رہا تھا۔ اس کتاب کے اہم حصوں کا ترجمہ E. A. نے سنہ ۱۹۶۳ء میں "اسلام کی روح"، (اسلامن روحو) کے نام سے (دوآن گنیش یائیں ایوی، استنبول صفحات ۱۸۸) اس میں اقبال کی مختصر سوانح کے علاوہ (۱) اسلامی کلچر (۲) اسلام کی بنیاد میں حرکت کا اصول (۳) دین حیات کے بارے میں (۴) اللہ کا مفہوم وعبادت کے معنی، کے عنوانات کے تحت ترجمے کیے گئے ہیں۔ کتاب کا زیادہ مکمل ترجمہ صوفی حوری نے "اسلام دادین تفکرن ینی دین تشکلو"، کے عنوان سے کیا (چلیتُت مطبع جی لِک کول، صفحات ۲۲۸، سنہ ۱۹۶۴ء) اس کتاب کا مقدمہ "اثرن تقدیمے"، کے عنوان سے ڈاکٹر این میری شمل نے لکھا ہے اور اقبال کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ اقبال کے تحقیقی مقالے کا ترجمہ (IRANDA METAFIZIGIN GELISMESI) (ایران دامیٹافزی ان گیلیشماسی) کے عنوان سے (استنبول مطبع سی، سنہ ۱۹۷۱ء صفحات ۹۴۔ آر۔سی۔ڈی نشریات نمبر ۳۰) شائع ہو چکا ہے۔

نسبتاً زیادہ مختصر کتابچوں میں بھری گوجل اور حسین پرویز حاتمی کے کتابچوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ بھری گوجل (BACRI GOCUL) نے "طور لالہ سی"، کے نام سے "لالۂ طور"، کے عنوان کی رباعیوں کا (اوزوار مطبع سی برُسا سنہ ۱۹۷۰ء صفحات ۱۶) اور پیامِ مشرق سے منتخب اشعار کا "پاکستان ملّی شاعرِ حکمت لی شعرلری"، کے نام سے ترجمہ کیا ہے (اوزوار مطبع سی برسا سنہ ۱۹۷۰ء صفحات ۱۶) حسین پرویز حاتمی نے جاوید سے خطاب کے نام سے جاوید نامہ کے بعض اشعار کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ (استنبول میں مطبع صفحات ۳۱ سنہ ۱۹۶۵ء) اس مختصر کتاب میں دیباچہ مرید و مرشد اقبال سنہ ۱۹۶۲ء میں حسین پرویز حاتمی کی سخن دانی) اور منظوم ترجمہ شامل ہے۔ ان کے علاوہ "پاکستان کے عظیم ملّی شاعر اقبال کے متعلق کانفرنس"، (انل مطبع سی، استنبول، صفحات ۳۹ سنہ ۱۹۵۲ء) اور "یومِ اقبال" (انقرہ یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر تحسین اوزگوچ کی صدارت میں ہونے والی کانفرنس کی روداد صفحات ۱۴ سنہ ۱۹۷۴ء) بھی شائع ہوئی ہیں۔

اقبال کے متعلق لکھنے والوں میں علی گنجیلی نمایاں اہمیت رکھتے ہیں۔ علی گنجیلی نے نہ صرف اقبال کے متعلق مضامین لکھے ہیں بلکہ ترکی میں سب سے زیادہ اقبال کا منظوم ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ علی گنجیلی کئی بار پاکستان آ چکے ہیں اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں (سقوطِ ڈھاکہ سے پہلے) کئی سال ترکی زبان کے استاد رہے ہیں۔ وہ پاکستان کی محبت میں پاکستانیوں سے کم نہیں۔ علی گنجیلی نے اسرارِ خودی اور پیامِ مشرق (کے اکثر حصوں) کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ رموزِ بے خودی کا بھی وہ پارہ پارہ منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ مثنوی، مسافر، کا بھی مکمل منظوم ترجمہ منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ بانگِ درا سے بھی وہ پارہ پارہ منظوم ترجمہ کرتے رہے ہیں۔ خصوصاً ان کا "شکوہ"، اور "جوابِ شکوہ"، کا ترکی منظوم ترجمہ کافی مقبول ہوا ہے۔ بالِ جبریل کے اشعار کا بھی وہ منظوم ترجمہ کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ زبورِ عجم کے اشعار کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے لیکن کم۔ علی گنجیلی اردو سے واقف ہیں اور براہ راست اردو سے ترجمہ کر سکتے ہیں۔ ان کے طلوعِ اسلام اور خضرِ راہ کے ترجمے بھی مقبول ہوئے ہیں۔ وہ "پس چہ باید کرد"، کے بعض حصوں کا منظوم اور بعض حصوں کا منثور ترجمہ کر چکے ہیں۔ ان کے ترجمے بوگنُ، ہرگن، سبیل المرشد، استقلال، ینی استقلال، اتحاد، حلقن سیسی، سون پوستا، سون تیلی گراف، پاکستان پوستاسی نام کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ علی گنجیلی فارسی بھی بخوبی جانتے ہیں اور ایران کے بعض اخباروں میں بھی انھوں نے اقبال سے متعلق مضامین لکھے ہیں۔

(اقبال و شعر ہائے او، اقبال و ادبیات ایران، اقبال و موقیعت ادبی او، در زبان اُردو، افکار و خیالات ایرانیان دربارۂ اقبال تصویرِ افکار، مہدِ آزادی، پارس) علی گنجیلی کو اقبال کے کلام سے عشق ہے اور وہ انھیں دنیا کے عظیم شاعروں کی صفِ اوّل میں شمار کرتے ہیں۔

ترکی میں اقبال کے متعلق اہم مقالے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی نشاندہی درج ذیل ہے۔

پاکستان کا ملّی شاعر اقبال ادیبہ دولو (EDIBADOLU) محمد اقبال، حیات و تخلیقات کے بارے میں مختصر معلومات، حسین حاتمی۔ اقبال اور عطیہ بیگم فیضی، ایس احمد۔ محمد اقبال (اقبال سے متعلق ایک مقالہ کا ترجمہ) کمال آک سوئے ہلال۔ اقبال اور مغربی شاعر، پاکستان کا عظیم شاعر، فلسفی اور مجاہدِ آزادی اقبال، ڈاکٹر اقبال اور کمال ازم (ترک یوردو)۔ اسلام میں توکل اور محمد اقبال، لیلیٰ کرمینلی۔ اقبال کی نظروں میں مثالی انسان، ڈاکٹر عابدین اِتل۔ اقبال اور نفعی مولانا کی آغوش میں، سینڑا احمد یلوز۔ ترکوں کا عظیم دوست اقبال، ڈاکٹر یونال ارال تگ (DR. UNAL TUG) ترکوں کا دوست اقبال، فواد بایرام اوغلو۔ اقبال کی حیات اور مولانا سے شیفتگی، محمد اوندر۔ اقبال اور ان کی تخلیقات سے بعض مثالیں، ڈاکٹر عابدین اِتل۔ محمد اقبال، نشید چغتائی۔ محمد اقبال اور ان کا زمانہ، فیوزی حالیجی۔ اتاترک اور اقبال کے یہاں عورت اور جوانی کا تصور ڈاکٹر مژگان جمبور (MUJGANCUMBUR) ان عنوانات سے ترکی میں اقبال اور فکرِ اقبال سے دل چسپی کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان لکھنے والوں کے علاوہ ملیحہ انبار جی اوغلو اور پری حان اری بردن (PERIHAN ARIBURUN) نے فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر وقتاً فوقتاً روشنی ڈالی ہے۔ دونوں کو اقبال سے گہری دل چسپی ہے۔ اقبال کے سلسلے میں ترکی میں مضمون لکھنے والے پاکستانیوں میں شریف الحسن، ڈاکٹر محمد صابر، ظفر حسن ابیک (اب ترک شہری) اور تنویر واسطی اہمیت رکھتے ہیں۔ ترکی میں متعین پاکستانی سفیروں میں میاں بشیر احمد، افتخار علی اور موجودہ سفیر الطاف احمد شیخ نے اقبال سے متعلق خصوصی دل چسپی لی ہے۔ ان کی مساعی سے ترکی میں اقبال کے مطالعہ کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ ان حضرات نے نہ صرف اقبال سے متعلق خصوصی جلسوں کا انعقاد کیا بلکہ خود اقبال پر مضامین لکھے اور پڑھے ہیں۔ اس سال شعبۂ اردو، انقرہ یونیورسٹی کے چوتھے سال کی طالبہ امید اوکائے (UMIT OKAY) نے اقبال کے اردو کلام کے منتخب حصوں کا ترجمہ اپنے تحقیقی مقالے کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس ترجمے کی خصوصیت متن سے عدم انحراف ہے۔ اب تک اقبال کی ان نظموں میں سے بیشتر کا ترکی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔

امید ہے کہ ترکی میں اقبال دوستی کا یہ سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ اور ہم ترکی میں مطالعۂ اقبال کو اقبالیات کے ضمن میں ایک اہم اضافہ کہہ سکیں گے۔

اقبال اور موریشس

عنایت حسین عیدن

اس عنوان سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ راقم اقبال اور سرزمینِ موریشس سے کوئی ایسا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے جو اقبالیات کے ماہروں کو چونکا دے۔ اور اقبالیات کی دنیا میں تہلکا مچا دے۔ اگر اقبال کے کلام میں یا ان کی کسی قسم کی تحریر میں اب وہ موریشس کا لفظ ڈھونڈنا شروع کر دیں تو ان کو پہلے ہی سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ اقبال اس لفظ سے ناآشنا رہے ہوں گے اور نہ ہی ان کے یہاں کبھی یہ تصوّر رہا ہوگا کہ ان کے نام سے موریشس کا نام جوڑا جائے گا۔

درحقیقت سرزمینِ موریشس میں اقبال کا نام اتنا ہی مشہور ہے جتنا کہ مسلمانوں کی تہذیب و کردار اور اقبال مسلمانوں کی تہذیب منسلک ہے۔ موریشس بحرِ ہند کے جنوبی حصے میں واقع ایک جزیرہ ہے جسے ہندستان سے آئے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں نے افریقی اور یورپی نسل کے لوگوں سے مل جل کر بسایا ہے۔ ہر نسل کے لوگوں نے اپنی اپنی زبان اور تہذیب کو قائم رکھا ہے۔ مسلمان اردو کو عربی کے ساتھ اپنائے ہوئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ انگریزی اور فرانسیسی بھی جانتے ہیں۔ اگرچہ مسلمان اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں پھر بھی وہ اس کو بول چال میں استعمال نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی لکھنے میں۔ اردو مادری زبان سے محض محبت و عقیدت کی بنا پر ہے۔ یہاں مسلمانوں کو اردو پر فخر و ناز ہے اور اسی طرح اردو سے متعلق ہر چیز سے ان کو محبت ہے۔ شروع میں اردو ادب و شاعری کا چرچہ اتنا نہیں تھا جتنا کہ فرانسیسی اور انگریزی ادب کا تھا۔ مگر پچھلے تیس ۳۰ برسوں سے مسلمانوں نے اردو زبان و ادب کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کی ہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات یہاں پر جاری کیے گئے۔ اس کے علاوہ یہاں سے چند طلبہ اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ اور علی گڑھ گئے اور واپس آکر اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ ذی نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے اردو ادب کو اور تقویت ملی ہے۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال کا تعارف موریشس میں حال ہی میں ہوا ہے۔ دراصل یہاں اقبال کو لوگ اسی زمانے سے جانتے ہیں جب وہ ہندستان میں مشہور ہوئے تھے۔ یہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اقبال کو یہاں وہ شہرت اس زمانے میں نہ ملی ہوگی جو ان کو ہندستان میں ملی تھی۔ کیونکہ یہاں کوئی بلند پائے کے ادیب یا عالم اقبال کے زمانے میں نہیں آتے تھے جو ان کے کلام کو روشناس کراتے۔ پھر بھی یہاں چند لوگ اقبال کو ان رسالوں اور کتابوں سے جانتے تھے جو ان کو کسی نہ کسی طرح مل جاتی تھیں۔ لیکن ایسے لوگ کم تھے۔

ہندستان کی آزادی کا چرچا پاکستان کے قیام کی جد و جہد اور موریشس کے لوگوں کے ابھرتے ہوئے سیاسی شعور نے موریشس کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اندر اپنی زبان و تہذیب کی حفاظت کرنے کا اور اس پر فخر کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ پاکستان کے قیام نے ان کو جہاں قائداعظم سے متاثر کیا وہاں اقبال کے نام سے بھی روشناس کیا۔ اُس زمانے میں ہندستان و پاکستان سے جو علمائے دین تشریف لاتے وہ اپنے وعظ میں علامہ اقبال کے اشعار ضرور سناتے۔ ان عالموں میں دو مشہور رہیں۔ ایک مولانا عبدالعلیم صدیقی جو میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ اور دوسرے مولانا عبدالرشید نواب جو حیدرآباد سے تشریف لائے تھے۔ اور موریشس ہی میں فوت ہوئے۔ دونوں نے اردو کی ترویج و اشاعت میں براہِ راست بڑا حصہ لیا۔

مولانا عبدالرشید نواب خود ایک بلند پائے کے عالم اور شاعر تھے۔ انھوں نے سیماب اکبرآبادی کی ایک نظم کے جواب میں ایک نظم لکھی تھی۔ مسلم ہائی اسکول کھول کر انھوں نے اردو کی درس و تدریس میں ایک نئی جان ڈالی۔ اس کے ساتھ انھوں نے اقبال کو ان کی چند نظموں کے ذریعہ مشہور کیا۔ یہ وہ نظمیں ہیں جن میں اقبال نے مسلمانوں کے بارے میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مولانا کے تین ایسے شاگردوں کو میں جانتا ہوں جنھوں نے اپنے طریقوں سے اقبال کو عوام تک پہنچایا ہے۔ جناب شوکت علی امام دین نے اپنے مدرسوں میں اور اپنی تقریروں میں اقبال کا اکثر ذکر کیا۔ انھوں نے مدرسوں میں بچوں کو اقبال کی شاعری سے روشناس کرایا۔ جن میں خاص طور پر یہ مشہور دعا:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

برسوں تک یہ دعا بچوں کو بہت سے مدرسوں میں سکھائی جاتی رہی۔ جناب عبدالرحیم پاروٹی صاحب جامعہ اردو کے امتحانات میں حصہ لینے والے امیدواروں کو اقبال کے اشعار پڑھاتے رہے۔ اور اس طرح انھوں نے اقبال کی شاعری کی خصوصیات طلبہ کے سامنے اجاگر کیں۔ مولانا موصوف کے تیسرے شاگرد جناب محمود امرت ہیں۔ یہ اسلام کے ایک مبلّغ ہیں۔ ان کی تقریریں کریولی میں ہوتی ہیں مگر ان میں کسی نہ کسی طرح سے اقبال کے اشعار لے آتے ہیں جنھیں وہ اردو میں پڑھتے ہیں اور ان کی تشریح دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ ان کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

جوں جوں اردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اقبال کی شہرت بھی بڑھتی گئی۔ بہت سے ایسے لوگ اقبال سے دلچسپی لینے لگے جو اردو پڑھنا نہیں جانتے اور اگر جانتے بھی ہیں تو اتنی اچھی طرح سے نہیں۔ یہ ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ اقبال کے کلام کے ترجمے انگریزی میں اور فرانسیسی میں ہو گئے ہیں۔ چنانچہ یہاں مسلمانوں میں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو اقبال کے ترجموں کے ذریعہ اقبال سے روشناس ہیں "اسرارِ خودی"، "رموزِ بے خودی"، "جاوید نامہ"، "ارمغانِ حجاز"، "شکوہ" "جواب شکوہ"، وغیرہ کے ترجمے ہیں۔ ان حضرات میں آپ کو قاسم شریف، حسن ہیرا، عبدالاحد فنڈن، محمد جومائی، عبدالرزاق، بخشو، خلیل الرحمٰن احمدی وغیرہ جیسے لوگ ہیں۔

اقبال بہ حیثیت مسلم شاعر

موریشس میں اقبال کی شہرت نہ ان کے فلسفہ سے ہے اور نہ ان کے اندازِ بیان سے۔ ان کی شہرت تو محض ان کے

اسلامی شاعر ہونے کے ناتے ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال موریشس میں مشہور ہیں تو صرف اس لیے کہ انھوں نے اسلام پر اور مسلمانوں پر لکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال محض مسلمانوں کے شاعر نہیں ہیں مگر عام طور پر انھیں مسلمانوں ہی کا شاعر مانا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کو مسلمانوں کی تہذیب اور زبان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے گہرے اثرات ہماری زندگی پر نظر آتے ہیں۔ ان میں ایک اثر تو یہ ہے کہ بہت سے بچوں کے نام اقبال یا محمد اقبال رکھے گئے ہیں۔ آج کل بیس پچیس سال کی عمر کے بہت سے لوگوں میں یہ نام مقبول ہے۔ اس کے علاوہ چند ایسے کلب یا ایسی انجمنیں ہیں جن کا نام اقبال کلب سرکل وغیرہ رکھا گیا ہے۔ جب ٹیچرز ٹریننگ کالج میں کلاس کے نام رکھے جانے لگے تو اردو والوں کی کلاس کا نام اقبال کلاس رکھا گیا۔

اقبال روڈ یا اقبال اسٹریٹ

ایک بہت دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ موریشس کے گاؤں میں اکثر اقبال روڈ یا اسٹریٹ نظر آتی ہیں۔ اگر آپ گاؤں کی سڑک کے کتبے پر اقبال روڈ یا اقبال سٹریٹ دیکھیں گے تو آپ بالکل یقین کر لیجئے کہ اس راستے پر بہت سے مسلمانوں کے گھر ملیں گے۔ گویا اقبال کا نام مسلمانوں سے منسلک ہے۔

ہر شعر جو اچھا لگے وہ اقبال کا ہوتا ہے

اچھے شعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ہمارے ہی دل کی بات کہی گئی ہے۔ موریشس میں اردو کے اچھے اور مقبول اشعار کے بارے میں عوام یہی کہتے ہیں کہ یہ اقبال کے لکھے ہوئے اشعار ہیں۔ گویا اگر کسی کو اچھا شعر سننے کا موقع ملے تو وہ یہ فوراً سوچنے لگتا ہے کہ یہ شعر اقبال ہی کا ہے اور ان کے علاوہ کوئی اس طرح کا اچھا شعر نہیں لکھ سکتا ہے۔ اس سے یہاں اقبال کی مقبولیت اور ان سے عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگوں نے اعلانیہ کہا ہے کہ اقبال کا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

یہ شعر اس زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا جب کہ موریشس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان فسادات ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اکثر مقرروں نے یہی کہا تھا کہ یہ شعر اقبال کا ہے۔ چنانچہ بہت سے جلسوں میں اسے پڑھا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ شعر بھی اقبال ہی سے منسوب ہے:

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

ہمیشہ یہ شعر اقبال کا شعر قرار دیا گیا ہے۔ چند ایسے سیاست داں بھی ہیں جو اپنی تقریروں میں اردو کے اشعار یا اردو کے چند فقرے استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اقبال کا ہے۔

اقبال اور سیاست

سیاست دانوں میں مرحوم سر عبدالرزاق محمد اقبال کے مداحوں میں تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں اقبال کے اشعار سنانے کے لیے مشہور ہیں۔ ان کو اقبال کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ خاص طور پر ایسے اشعار جن کا تعلق مسلمانوں سے ہو۔ چونکہ مرحوم کو مسلمانوں سے بڑی محبت تھی۔ کئی بار انھوں نے اقبال پر تقریر بھی کی۔ ہم لوگ مرحوم کو اکثر جلسوں میں بلایا کرتے تھے جو اقبال کی یاد میں منائے جاتے تھے اور انھوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک طالب نے اقبال کی یہ دعا پڑھی تھی:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

اس وقت سردار عبدالرزاق مرحوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ جناب عبدالرؤف بندھن سابق وزیر کو بھی اقبال سے دلچسپی ہے۔ انھوں نے بھی کئی بار اپنی تقریروں میں اقبال کے اشعار سنائے ہیں۔ آج کل سر زبندگو بدن بھی اقبال کے اشعار اپنے انداز میں سناتے ہیں۔ اسی طرح چند اور سیاست داں ہیں جن کو اقبال سے دلچسپی ہے۔ مگر زبان نہ جاننے کی وجہ سے وہ اقبال سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ ہنوربل قاسم اوتیم، ہونربل، صالح کازنلی اور چند دوسرے ایم۔ ایل۔ اے بھی اقبال کے اشعار سناتے ہیں۔

مقامی ادب میں اقبال

مورلیشس کے کئی فرانسیسی یا انگریزی رسالوں میں اقبال پر مضامین مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ مضامین سطحی طور پر لکھے گئے ہوتے ہیں۔ مضامین دراصل سطحی طور پر لکھے گئے ہیں کیونکہ لکھنے والوں نے اقبال کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا۔ ان لوگوں کو اقبال کے کلام پر اور خود اقبال پر ایسی کتابیں دستیاب نہیں ہو پاتیں جن کی مدد سے وہ بہتر مضامین لکھ سکتے۔ یہ توقع کرنا کہ مورلیشس میں اقبال پر کوئی بلند پایہ مضمون لکھا جائے، ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں نے اقبال کا مطالعہ کیا بہت سرسری طور پر کیا ہے۔ تاہم یہ خوشی کی بات ہے کہ مورلیشس میں ایسے کئی نوجوان ہیں جنھوں نے نہ صرف اقبال کا مطالعہ کیا ہے اور اقبال پر مضامین لکھے ہیں بلکہ ممتاز امرت نے اپنی کتاب "مسلمس اِن مورلیشس" میں اقبال کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کیا۔ اس کے علاوہ اقبال کے متعلق چند رسالوں میں ان کے دو تین مضامین مل جاتے ہیں۔ حسن ہیرا کی وہ نظمیں جو انگریزی اور فرانسیسی میں لکھی گئی ہیں، ان میں بھی اقبال کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اسی طرح رزاق بخشو کی کتابوں اور رسالوں میں بھی اقبال کے خیالات کے اثرات نمایاں ہیں۔

مذہبی جلسوں میں اقبال

مذہبی جلسوں اور تقریروں میں اقبال کے وہ اشعار جن میں اسلام یا رسول کریمؐ کا ذکر ہے سنائے جاتے ہیں۔ ہر سال

یوم النبیؐ کے موقع پر ایک شاندار جلسہ ہوتا ہے جس میں مورلیشس کے وزیر اعظم اور دیگر مذاہب کے رہنما بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس جلسے کی صدارت اکثر جناب احمد عبداللہ احمد فرماتے ہیں۔ آپ مورلیشس کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو تن من دھن سے اردو کی خدمت کرتے ہیں۔ میلاد النبیؐ کے جلسوں میں آپ اقبال کے ایسے اشعار جذبات کے شدت سے پڑھتے ہیں جن سے رسول کریمؐ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان اشعار سے دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے حضرات بھی مذہبی جلسوں میں اقبال کے اشعار سناتے ہیں۔ مورلیشس میں بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جو دینِ اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان میں جناب خلیل الرحمٰن احمدی بھی ہیں۔ آپ کی اکثر تقریروں میں اقبال کے اشعار کے حوالے ملتے ہیں خاص کر ایسے اشعار جن میں مسلمانوں کی اصلاح کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح جناب محمود امرت بھی تقریروں میں اقبال کے اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ ان اشعار سے ان کی تقریروں میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور سامعین پر اچھا اثر ہوتا ہے۔

یومِ اقبال اور اقبال نمائش

مورلیشس میں یوم اقبال یا اقبال ڈے کے نام سے اکثر پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ یہ پروگرام مختلف اداروں یا انجمنوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں یہاں چند ایسی انجمنیں ہیں جن کے زیر اہتمام ہر سال یہ پروگرام ہوتا ہے۔

۱۹۶۷ء میں مدد اسلام کالج یونگ میں مسلم ایسوسیشن کی طرف سے اقبال پر ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اقبال کی تصویروں کی نمائش بھی کی گئی۔ ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء میں پلین دے پاپائی میں جناب فاروق بوجھانے اپنے دوستوں کی مدد سے بڑے پیمانے پر اقبال پر جلسے کیے جن میں نہ صرف ان کے علاقے کے بلکہ دوسرے علاقوں کے لوگ بھی شریک ہوئے ان جلسوں کا ذکر آج تک لوگ کرتے ہیں۔ ان موقعوں پر اقبال پر دو رسالے نکالے گئے۔ کانجاب کے مسلم لٹریری سرکل کی طرف سے کئی بار اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے یوم اقبال منایا گیا۔ ان اداروں اور انجمنوں کے علاوہ اور بہت سی جگہوں پر دوسری انجمنوں نے بھی پروگرام کیے ہیں۔

ڈاکٹر اطہر پرویز

ہندستان کی سرکار کی طرف سے اردو کی ترویج و اشاعت کی غرض سے اردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر اطہر پرویز مورلیشس تشریف لائے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز اردو کے لیے بہت سے اچھے کام کئے ہیں۔ آپ اقبال کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی بڑی مدد کی۔ اقبال پر جو جلسے ہوتے ان سب میں وہ شریک ہوتے تھے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور اپنی تقریروں سے اقبال کے مختلف پہلوؤں کو روشناس کراتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر پرویز نے خلوص کے ساتھ اقبال پر پروگرام تیار کرنے میں اپنی قابلیت اور مشوروں سے نوازا۔ پلین دے پاپائی کے جلسوں کی کامیابی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ٹیچرز ٹریننگ کالج میں اردو پڑھاتے وقت آپ نے طلبہ میں اقبال سے مزید دلچسپی پیدا کی۔ دوسرے کالجوں میں بھی آپ نے غیر مسلم طالب علموں کو اقبال پر لیکچر دئے۔

ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ

ڈاکٹر اطہر پرویز صاحب اور راقم الحروف کی تجاویز اور کوششوں سے اور چند محبانِ اردو کی مدد سے "ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ یہ ادارہ رضا کارانہ طور پر اردو کی ترویج و اشاعت کی غرض سے قائم ہوا۔ اس ادارے میں جہاں اردو کے لیے اور بہت سے کام ہوتے ہیں وہاں ہم اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ہر سال جلسے کرتے ہیں۔ ابتدا میں ہمارے جلسے ۲۱ اپریل یا لگ بھگ اسی زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ مگر جب ہمیں اقبال اکیڈمی کراچی کی طرف سے اقبال کی تاریخ ولادت معلوم ہوئی تو ہم اقبال پر پروگرام پہلے یا دوسرے سنیچر کو کرنے لگے۔ ہمارے جلسے اردو انسٹی ٹیوٹ ہی میں ہوتے ہیں۔ ان جلسوں میں ہندستان اور پاکستان کے نمائندے شریک ہوتے ہیں۔ پاکستان کے سفیر جناب انور خان نے اکثر اقبال پر تقریریں کی ہیں۔ تقریروں کے علاوہ اقبال کی غزلیں اور نظمیں طلبہ کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں۔ بعض اوقات اس ادارے کے طلبہ، اساتذہ اقبال پر اپنے مضامین پڑھ کر سناتے ہیں۔ اقبال سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے دو تین بار غزل خوانی کے مقابلے رکھے۔ اقبال کی شاعری پر بیت بازی کے مقابلے بھی رکھے گئے۔ شکوہ اور جواب شکوہ کو ڈرامائی انداز میں بھی پیش کیا گیا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اقبال پر فیچر اردو انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے پیش کیے جاتے ہیں۔

اقبال کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر "ذی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ" نے اقبال پر ایک پروگرام کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ راقم الحروف کی کوششوں سے اور دوستوں کی مدد سے موریشس کے کونے کونے میں اقبال پر جلسے کیے گئے، لوگوں تک اقبال کا پیغام پہنچایا گیا اور مختلف گاؤں کی مسجدوں اور مدرسوں میں یوم اقبال منایا گیا۔ اردو انسٹی ٹیوٹ کی سرپرستی میں بریزے ورجیر میں ایک اقبال ویک کا اہتمام کیا گیا جس کے دوران روزانہ اقبال کے متعلق ایک ہفتہ تک کسی نہ کسی طرح کا پروگرام ہوتا رہا۔ یہ اقبال ویک کافی کامیاب رہا۔ اقبال پر ایک روزہ سیمینار بھی کیا گیا جس میں اقبال سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے حصہ لیا۔

ہم لوگوں نے اپنے وسائل اور قابلیت کے مطابق اپنا فرض سمجھ کر اس عظیم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس میں ہماری سچی محبت اور خلوص شامل تھا۔

اقبال تمغہ

حکومت پاکستان کی طرف سے سفیرِ پاکستان نے ان لوگوں کو تمغے پیش کیے جنھوں نے اقبال کا پیغام عوام تک پہنچایا۔ ان میں یہ حضرات قابلِ ذکر ہیں:۔ عالی جناب ہیرولڈ والٹر (وزیر خارجہ) عالی جناب یوسف محمد (سابق وزیر) عالی جناب عبدالرزاق پیرو (وزیر) عالی جناب جگت سنگھ (وزیر تعلیم) عالی جناب سر سیوساگر رام غلام اور وزیر اعظم جناب عبداللہ احمد۔

اقبال سے محبت کرنے والے اور بہت سے لوگ موریشس میں موجود ہیں اور اقبال پر بہت سے ایسے اور پروگرام یقیناً ہوتے ہیں جن کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ہے۔ مضمون کی طوالت کے خوف سے اس مضمون میں تمام لوگوں یا اداروں کا نام نہیں لیا جا سکا۔

علامہ اقبالؒ اور سر علی امام

صادق امام زیدی

حکیم ملّت علامہ اقبال ایک جوہر قابل ہونے کے ساتھ جوہر شناس بھی تھے۔ ان کے حلقۂ احباب کا دائرہ بہت وسیع تھا جس میں ہر شعبۂ زندگی کے افراد شامل تھے۔ سر علی امام کا بھی ان ہی میں شمار ہوتا ہے جو اپنی گوناگوں صفات کے باعث علامہ کا مرکز التفات بن گئے تھے۔

سر علی امام نواب شمس العلما سیّد امداد امام اثرؔ عظیم آبادی کے فرزند اکبر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی جسٹس حسن امام بھی ایک ماہر سیاست اور قانون داں تھے۔ ان کی قومی خدمات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ڈاکٹر انصاری مرحوم کی قیادت میں ترکی کی امداد کے لیے جو وفد گیا تھا، مسٹر حسن امام اس وفد کے ایک سرگرم رکن تھے۔ ان دونوں نامور بھائیوں سے خاندان مشہور ہوا اور امام فیملی کی شہرت کو پر لگ گئے۔ اپنے زمانے میں یہ لوگ آسمانِ سیاست و قانون کے آفتاب و مہتاب کہے جاتے تھے۔

سر علی امام پٹنہ (بہار) کی ایک مردم خیز بستی بیوہ میں ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ وہ کم سنی سے انتہائی ذہین اور سنجیدہ تھے۔ اور یہ خصوصیت عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ وہ انٹرنس (میٹرک) کے امتحان میں صوبہ بھر میں اول آئے اور کچھ عرصہ کے بعد بیرسٹری کے لیے عازمِ انگلستان ہو گئے۔ وطن واپسی کے بعد پہلے کلکتہ ہائی کورٹ اور پھر پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔ سر علی امام وائسرائے کی کونسل میں وزیرِ قانون تھے اور اسی وقت انھوں نے بنگال کو تقسیم کرا دیا جس سے مسلمانوں کی اکثریت قائم ہو گئی اور اس طرح شمالی و مغربی ہندستان میں مسلم اقتدار کو استحکام حاصل ہوا۔ حضور نظام نے ان کی قانونی اور مدبرانہ بصیرت کے پیشِ نظر حیدر آباد طلب کر لیا۔ جہاں وہ مدار المہام کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ انھوں نے ایک ایسی اسکیم پیش کی جس سے حیدر آباد میں مسلم اکثریت کی راہ ہموار ہو سکتی تھی مگر بدقسمتی سے ریاست کی روایتی سازشوں نے اس مفید اسکیم کو ناکام بنا دیا۔ سر علی امام کی قومی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے جن میں سے چند یہ ہیں۔

تقسیم بنگال۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی ٹرسٹی شپ۔ مسجد کانپور کا مسلمانوں کے حق میں تصفیہ۔ ریاست حیدر آباد دکن میں عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی۔ برار کا ریاست حیدر آباد سے الحاق۔ ریاست کی انجمن صفتہ الاسلام کی سرپرستی۔ مظلوم مُوپلا خاندانوں کی ریاست میں آبادکاری۔ ۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ امرتسر کے سالانہ اجلاس کا عدیم المثال صدارتی خطبہ۔ وغیرہ۔

سر علی امام کے مختصر حالات زندگی لکھنے کے بعد میں علامہ اقبال اور سر علی امام کے مخلصانہ مراسم کی طرف آتا ہوں جو اس مضمون کا

اصل موضوع ہے۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ سر علی امام اور علامہ اقبال کے مراسم کی ابتدا گول میز کانفرنس سے ہوئی مگر یہ غلط ہے۔ گول میز کانفرنس سے برسوں پہلے ۱۹۱۵ء میں "اسرارِ خودی" کا انتساب سر علی امام کے نام کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ان کی قومی و ملی خدمات کا اعتراف مندرجہ ذیل اشعار میں کیا تھا۔

اے امام اے سید والا نسب — دودمانت فخر اشرافِ عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی — عقل کل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنیٔ بیگانۂ!! — جلوۂ شمع مرا پروانۂ!!
مرغ فکرم گلستاں با دیدہ است — از ریاضِ زندگی گل چیدہ است
ایں گل از تارِ رگ جاں بستہ ام — تازہ تر در دست تو گلدستہ ام
بود نقش ہستیم انگارۂ!! — ناقبولے ناکسے ناکارۂ!!
عشق سوہاں زد مرا آدم شدم — عالم کیف و کم عالم شدم
حرکتِ اعصاب گردوں دیدہ ام — در رگ مہ دورۂ خوں دیدہ ام
بہر انساں چشم من شبہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات — برکشیدم سرِ تقویم حیات
من کہ ایں شب را چو مہ آراستم — گرد پائے ملتِ بیضا ستم
ملتے در باغ و راغ آوارہ اش — آتش دلہا سرود تازہ اش
ذرہ کشت و آفتاب انبار کرد — خرمن از صد رومی و عطار کرد
آہ گرمم رخت بر گردوں کشم — گرچہ دودم از تبارِ آتشم
خامہ ام از ہمت فکر بلند — راز ایں نہ پردہ در صحرا فگند
قطرہ، تاہم پایۂ دریا شود!!! — ذرہ از بالیدگی صحرا شود
چشم از نورِ محبت روشنم — اشک بار از درد اعضائے تنم

نذر اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

اس نظم میں علامہ اقبال نے جن پر خلوص جذبات کا اظہار کیا ہے وہ جذبات دیرینہ مراسم ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں لہذا سر علی امام اور علامہ اقبال کے تعلقات گول میز کانفرنس سے بہت پہلے استوار ہو چکے تھے بقول جناب سید عبدالواحد اس وقت برصغیر میں اس انتساب کے اہل صرف سر علی امام کی ذات گرامی تھی۔

سر علی امام کم و بیش ۷ سال تک وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں ان سے اور علامہ اقبال سے دہلی

اور شملہ میں وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ سر علی امام علامہ سے ملنے لاہور بھی جاتے رہے۔ ایک مرتبہ ان کی لاہور آمد پر علامہ اقبال نے برجستہ یہ شعر کہا ؎

نگہبانِ حقوقِ امتِ خیر البشرؐ آیا
مسلمانو مبارک ہو امامِ منتظر آیا

علامہ اقبال اور سر علی امام کے مخلصانہ تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب سیّد عبدالواحد راجہ صاحب پیر پور کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"جب علامہ دوسری گول میز کانفرنس کی غرض سے انگلستان تشریف لے جا رہے تھے تو اُس جہاز پر میں اور سر علی امام بھی ہمسفر تھے۔ دن بھر اور رات کے بیشتر حصہ میں علامہ اور سر علی امام جہاز کے عرشہ پر آکر کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ اور دن بھر تصوّف اور فلسفہ کی گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ان دونوں اصحاب کی گفتگو ایسی عمیق ہوتی تھی کہ میں (راجہ پیر پور) اس کا بیشتر حصّہ سمجھنے سے قاصر رہتا۔ علامہ اپنے اشعار سناتے اور سر علی امام اردو، فارسی اور عربی کے اشعار سناتے۔ اکثر تصوّف کی باتیں ہوتیں۔"

عبدالواحد صاحب مزید لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال سر علی امام کے علم اور حُسن اخلاق کے بے حد مدّاح تھے۔ ان کی قانونی حیثیت تو برصغیر میں مسلّم تھی۔ لہٰذا یہ صاف ظاہر ہے کہ سر علی امام ایک بہت ہی باکمال شخص تھے اور علامہ کا "اسرار خودی" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کا انتساب اسی اخلاص، احترام اور اُنس کے تعلقات پر مبنی تھا جو ان دو عظیم المرتبت اور فخرِ روزگار انسانوں کے مابین قائم تھے۔"

(اقبال ریویو جنوری ۱۹۷۱ء)

مولانا ظفر علی خاں مرحوم برطانوی استعمار پرستی کے ہمیشہ خلاف رہے اور "سر" اور "خان بہادر" کی حمایت کو کبھی پسند نہ کیا۔ مگر انھوں نے بھی اس جماعت میں صرف علی امام کی شخصیت کو مستثنیٰ قرار دیا۔ چنانچہ سر علی کی اسلام دوستی کی اپنے ان اشعار میں ستائش کی ہے ؎

سروں کے ذکر پر اک دوست نے سوال کیا
کہ اس گروہ میں کچھ لوگ نیک نام بھی ہیں؟
مری نظر میں تو سب سر ہیں نفس کے محکوم
اور اس کے ساتھ ہی سرکار کے غلام بھی ہیں
دیا جواب یہ میں نے کہ ان کو کچھ نہ کہو
اسی گروہ میں سید علی امام بھی ہیں

اسی طرح نواب بہادر یار جنگ مرحوم بھی سر علی امام کی خوبیوں کے معترف تھے۔ اس سلسلے میں جناب انیس الرحمٰن ایڈوکیٹ لکھتے ہیں:

"ایک بار بہادر یار جنگ مولانا مناظر احسن گیلانی کے دولت کدہ پر تشریف لائے تو ادِھر اُدھر کی گفتگو کے بعد سر علی امام کا ذکر خیر چھڑ گیا۔ بہادر یار جنگ سر علی امام کا نام سن کر انتہائی متاثر ہوئے۔ آنکھیں پُر نم ہو گئیں اور اپنے ہاتھ کو سینہ پر رکھ کر ایک آہ سرد بھری اور نہایت ہی غمگین لہجے میں کہا کہ سر علی امام کا نام نہ لیجئے میرا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔

سر علی امام کی شخصیت کو حیدر آباد کے مسلمانوں نے نہیں سمجھا وہ حیدر آباد اسٹیٹ میں مسلم اقتدار کو قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے اور اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انتہائی فکر مند تھے۔ ہائے افسوس! نادان دوستوں نے اسے ناکامیاب کر دیا اور اب حیدر آباد کے وجود کو خطرہ لاحق ہے۔ اس خطرہ کا اندازہ سر علی امام نے پچیس۲۵ سال قبل کر لیا تھا۔ اتنا بڑا دور اندیش انسان برصغیر نے پیدا نہیں کیا۔" (کتابچہ سر علی امام صفحہ)

دوسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال اور سر علی امام جہاز میں شریک سفر تھے۔ اس موقع پر اقبالؒ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں: "بریک فاسٹ کے بعد عرشہ جہاز پر ہمسفروں سے گفتگو یا گول میز جس کی خبریں لاسلکی کے ذریعہ ہر روز جہاز پر پہنچ جاتی ہیں۔ ان پر بحث و مباحثہ یا گزشتہ سال کی رپورٹوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی شعر و شاعری بھی ہو جاتی ہے۔ سیّد علی امام کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور وہ پڑھتے بھی خوب ہیں۔ الولد سرٌ لابیہ۔ ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد امام ادبیات اردو میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں۔ سیّد علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشۂ جہاز پر کھڑے تھے میں بھی ان کے ہمراہ تھا میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے: بھائی اقبال اس وقت ہمارا جہاز ساحلِ مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی۔ ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اور بے اختیار ہو کر بولے:

مع بلغ سلامی روضۃ فیھا النبیؐ المحترم

ان کے قلب کی اس کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔"

(گفتارِ اقبال صفحہ ۱۳۲)

سر علی امام کی وفات کے متعلق سید عبدالواحد رقم طراز ہیں:

"الغرض ملک و ملّت کی ہر شعبہ میں خدمت کر کے اور زندگی کے ہر شعبہ میں شہرت حاصل کر کے سر علی امام نے ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۲ء؁ کو رانچی (بہار) میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ کل برصغیر میں ان کی وفات حسرت آیات پر قوم اور ملت اور ہر طبقہ کی طرف سے اظہار رنج و ملال کیا گیا۔" (اقبال ریویو جنوری ۱۹۷۱ء؁)

اس سانحۂ ارتحال پر علامہ اقبال نے سر علی امام کے والد ماجد نواب امداد امام اثر ——— کے نام ایک دردمندانہ تعزیتی تار ارسال کیا تھا۔ افسوس کہ وہ دستبرد زمانہ کے سبب ضائع ہو گیا۔

پیر حسام الدین راشدی

(ایک منفرد علمی شخصیت)

سحر انصاری

یہ زندگی اور موت کا تجربہ بھی عجیب ہے۔ اگر کوئی وجود یہ سوچنے لگے کہ زندگی صرف نفس کی آمد و شد کا نام نہیں اور یہ کہ اپنے عمل سے زندہ ہونے کا ثبوت دینا ہر انسان کے لیے ضروری ہے تو پھر وہ غور و فکر اور علم و آگہی کے محیطِ بیکراں کی جانب توجہ دینے لگے گا۔ لیکن ایک اصولِ فطرت یہ بھی ہے کہ جب یہ تشکیلی دور ختم ہوتا اور اپنے مسلک کو اعتبار سے ہمکنار کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو اسی لمحہ موجِ فنا کا تھپیڑا اسے اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے:

آگیا جب سلیقۂ تعمیر
قصرِ ہستی کو بے اساس کیا

اسی لیے شاید ہر غیر معمولی فرد کی موت پر یہ احساس ناگزیر حیثیت اختیار کر جاتا ہے کہ اس کی کمی پوری نہ ہو سکے گی۔ پھر ہمارے معاشرے میں ویسے بھی تو علمی ادبی کام کرنے والی شخصیتیں معدودے چند ہوتی ہیں کیونکہ ہماری عام زندگی کی فہرستِ ترجیحات میں ایسی چیزوں کو سب سے آخر میں رکھا جانے لگا ہے۔

پیر حسام الدین راشدی ایک علمی شخصیت کی حیثیت سے اپنا ایسا نقش چھوڑ گئے ہیں کہ حقیقتہً تحقیق و علم اور معارف پروری کے اس منظر نامے پر ان کی کمی بار بار محسوس ہوتی ہے۔ پیر صاحب ایک شخص ہی نہیں، ایک شخصیت بھی تھے۔ ان سے مل کر حقیقی مسرت اور طمانیت حاصل ہوتی تھی وہ اپنی عام گفتگو میں کبھی کتابی علم کو درمیان میں نہیں لاتے تھے لیکن جو کچھ وہ کہتے تھے اس کا تعلق کتابِ زندگی کی حقیقی عبارتوں سے ہوتا تھا۔ البتہ جب کسی خاص تاریخی یا تحقیقی موضوع پر لکھتے، بولتے یا تقریر کرتے تھے تو اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔

پیر صاحب خود ساختہ شخصیت کی ایک اعلیٰ مثال تھے۔ انھوں نے اپنے مزاج اور طرزِ حیات کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لیا تھا جو کہیں سے بنا بنایا نہیں ملتا بلکہ اسے بڑی محنت اور جانفشانی سے تیار کرنا پڑتا ہے۔

پیر حسام الدین راشدی ایک خوش لباس، خوش اخلاق اور خوش گفتار انسان تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک ہلکا سا

تبسم رہتا تھا۔ اور بڑے ٹھہرے ہوئے، پُرسکون انداز میں اپنا موقف بیان کرنے پر قادر تھے۔ پیر صاحب نے اس قدر علمی اور تحقیقی کام کیا بے شمار تاریخی، علمی، ادبی، تدریسی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ تھے لیکن کبھی انھیں عجلت میں مبتلا نہیں دیکھا گیا۔ سارے کام وقت پر ہوتے تھے کیوں کہ وقت کے بہت پابند تھے لیکن سکون اور ٹھہراؤ، تحمل اور توازن میں کمی نہیں آتی تھی۔ ان کا حافظہ قوی تھا۔ سارے حوالے، سن، واقعات وغیرہ موقع محل کی مناسبت سے زبانی بیان کرتے چلے جاتے تھے۔

پیر صاحب کا صحافت اور ادبی سرگرمیوں سے عملی تعلق تیسری دہائی کے آغاز سے ہوتا ہے اور چوتھی دہائی کے وسط تک انھوں نے اچھی خاصی استعداد اور اہمیت اپنے گرد و پیش کے ماحول میں حاصل کر لی تھی۔ تا ایں کہ جب پاکستان بنا اور بابائے اردو مولوی عبدالحق یہاں تشریف لائے تو ایئر پورٹ پر آکر خیر مقدم کرنے والوں میں انھوں نے دیگر حضرات کے علاوہ پیر حسام الدین راشدی کا تذکرہ بھی یوں کیا:

"جہاز ساڑھے بارہ بجے کراچی پہنچا۔ ہوا خانہ پر شعیب قریشی، خان عبداللطیف خان اور پیر حسام الدین صاحب تھے۔"

یہاں پیر صاحب نے بڑی لگن اور تن دہی سے مولوی صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ انجمن کے از سرِ نو قیام سے لے کر اس کے مالی اور انتظامی معاملات میں بھی وہ تگ و دو کرتے وقت مولوی صاحب کے ہمراہ ہوتے تھے۔ لیکن اس اثنا میں کتابوں، مطالعے اور علم کی مختلف جہات سے ان کی دلچسپی قائم رہی۔ شاید اس کا ایک بڑا سبب وہی ہے جو ان کے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ان کے زیر اثر ایک تو مطالعے کا شوق تھا۔ دوسرے بقول علی محمد راشدی صاحب:

"میرا کنٹری بیوشن حسام الدین کی تربیت میں اس سے زیادہ نہیں تھا کہ میں نے اس پر سخت ڈسپلن عائد کر دی۔ ..... اس کی طبیعت میں کئی نئی چیزیں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً کھیل کود سے قطعاً نفرت، بے انتہا سیلف ڈسپلن اور ادب، دل، دماغ اور زبان پر انتہائی ضابطہ، مطالعہ، محنت مشقت سے نہ گھبرانا، تجسّس اور تحقیق کا شوق، عمر ابھی بارہ اور تیرہ سال کی تھی مگر بچپنے کی کوئی چیز اس کی طبیعت میں نہیں رہی تھی، بالطبع احساس تھا۔"

حسام الدین راشدی ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے گویا قیامِ پاکستان کے وقت ان کی عمر ۳۶ سال تھی۔ اسی زمانے میں چار پانچ سال کے اندر اندر انھوں نے اپنے ایک طویل تحقیقی مقالے کے ذریعے ایسی برصغیر گیر شہرت حاصل کر لی کہ اہلِ علم و کمال نے ان کی تحقیق کی داد دی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ وہ مقالہ تھا سندھ اردو کی بابت جو انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شائع ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "نقوش سلیمانی" کے پاکستانی ایڈیشن کے ابتدائیہ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں اس کی اہمیت یوں واضح کی:

"یہ (نقوش سلیمانی) پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اُردو کے مولد کی تعین و تشخیص کے باب میں سندھ اور ملتان کی نشاندہی کی گئی اور یہ اشارات سب سے

پہلے ۱۹۱۵ء کے اجلاسِ اردو کے خطبۂ صدارت میں کیے گئے۔ پھر بعد کے خطبوں اور مقالوں میں ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی۔

شروع شروع میں تو اس پر بعضوں نے کم سمجھی سے طعن و طنز بھی کیے مگر تاریخ نے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں اپنے کو دہرا کر ماضی کی حقیقتِ حال کے پردہ میں لاکر سب کے سامنے پیش کر دی، یہاں تک کہ ایک سندھی محقق نے پیر حسام الدین صاحب نے اس موضوع پر ایک تحقیقانہ مقالہ لکھ کر انجمن ترقی اردو میں ابھی پیش کیا ہے۔"

علامہ سید سلیمان ندوی کا کسی کو محقق لکھ دینا کوئی کم اہم بات نہیں ہے۔ حسام الدین راشدی نے اس مقالے کے بعد کم و بیش پچاس کتابیں اردو، فارسی اور سندھی میں تصنیف یا تالیف کیں اور مضامین کی تعداد تو سیکڑوں تک پہنچ چکی تھی ساتھ ہی ساتھ وہ تقریباً چالیس علمی، ادبی، ثقافتی اور تدریسی نوعیت کے اداروں اور جامعات سے ۱۹۴۷ء سے اپنی وفات (۱۹۸۲ء) تک کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے۔ اور پیر صاحب کی یہ وابستگی ان نام نہاد "بڑے آدمیوں" کی سی نہیں تھی جو کسی ادارے کے عہدہ دار، سرپرست یا رکن تو بڑے ذوق و شوق سے بن جاتے ہیں لیکن کبھی پلٹ کر بھی نہیں پوچھتے کہ اس کی کارکردگی کی نہج اور نوعیت کیا ہے اور اس کے عروج یا زوال میں خود ان کی "وابستگی" کا کتنا ہاتھ ہے۔

پیر صاحب ادارۂ یادگارِ غالب کراچی کے نائب صدر تھے، فیض احمد فیض صاحب صدر، مرزا ظفر الحسن معتمد عمومی اور میں اس ادارے کا نائب معتمد تھا۔ اس زمانے میں پیر صاحب کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پیر صاحب میں ایک ادیب کا آئیڈیلزم تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک محقق کا صبر و سکون، تلاش و جستجو بھی تھی اور پھر عملی سوجھ بوجھ نے ان کے ہر خواب کو عملی شکل دینے کی سبیل پیدا کر دی تھی۔ ادارے کے ہر اہم اجلاس میں ان کی تجاویز بہت معقول ہوتی تھیں۔ وہ کھرے، بے باک اور نڈر انسان تھے۔ اور جب اختلافِ رائے بھی کرتے تو ان کے لہجے میں شائستگی، تحمل اور بردباری ہوتی تھی۔ میں نے انھیں کئی اجتماعات میں سنا ہے، نجی محفلوں میں شریکِ گفتگو دیکھا ہے اور ہمیشہ محسوس کیا کہ وہ انتہائی اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے لب و لہجہ کو شائستہ اور مہذب ہی رکھتے تھے۔ غصّہ اور ناشائستگی انھیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ ان کے لہجے میں ایک عالم کا سا ضبط اور مدبّر کا سا توازن پایا جاتا تھا۔

پیر صاحب بہت خلیق اور متواضع شخصیت تھے۔ پاکستان کے احباب تو ان کے ہاں کسی نہ کسی انداز میں پائے ہی جاتے تھے لیکن ایران، ہندستان، جرمنی، امریکہ، انگلستان وغیرہ سے جب بھی کوئی مورّخ، محقّق یا عالم آتا، پیر صاحب اپنے مراسم کے مطابق اس کی دعوت کرتے اور شہر کے ان ادیبوں اور اہلِ قلم کو مدعو کرتے جن کے کام اور ذاتی اخلاق سے "مطمئن" تھے۔ سال میں کم سے کم ایک بار آموں کی نہایت پُرتکلف دعوت ہوتی تھی۔ اس دعوت کی ابتدا سندھ کے مشہور مشروب تھادل سے ہوتی تھی پھر اعلیٰ درجے کا عشائیہ ہوتا تھا اور پھر قسم قسم کے آم نہایت وافر مقدار میں بڑے سلیقے سے رکھے ہوتے تھے۔ بجائے خود ایک "دربارِ آم" کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

پیر صاحب اپنی علمیت، تحقیقی مصروفیات اور متانت کے باوجود بہت بزلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ اور کبھی کبھی شوخی و ظرافت کا نمونہ بھی نظر آتے تھے۔ ایک خاتون جن کا تعلق ادب اور تدریسِ ادب سے تھا ان کے ہاں آتی تھیں اور ہر بار اپنے شوہر کو بھی لے آتی تھیں جن کا تعلق ادب سے بس واجبی سا تھا۔ پیر صاحب ان کے شوہر صاحب کے گم صم اور بے تعلق ہو کر بیٹھے رہنے سے اکتا جاتے تھے۔ ایک دن اُن خاتون سے بولے "بھئی یہ بتایئے ہم نے آپ کو کبھی اپنی بیوی سے ملوایا ہے؟"

"نہیں پیر صاحب" ان خاتون نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ ہمیں اپنے شوہر سے کیوں ملواتی ہیں؟" پیر صاحب اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ گویا ہوئے۔

پیر صاحب کی یہ بزلہ سنجی انھیں جلد ہی جانِ محفل بنا دیتی تھی۔ ان میں ایک بہت بڑا وصف یہ تھا کہ گفتگو ہمیشہ موقع محل کی مناسبت سے کرتے تھے۔ جب محسوس کرتے کہ اس وقت ہلکی پھلکی گپ شپ کا رجحان اہلِ محفل پر ہے تو اسی انداز کی باتیں کرتے تھے۔ کبھی اپنے علم یا مطالعے کو تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اور جب کسی علمی موضوع یا علمی مباحث پر بولتے تھے تو ان کے قوی حافظے، مطالعے اور طرزِ استدلال کا قائل ہو جانا پڑتا تھا۔

پیر صاحب کا ایک بہت بڑا کارنامہ سندھی اور فارسی زبان کی بعض قدیم تصانیف اور تذکروں کی از سرِ نو اشاعت ہے۔ ان کتابوں کے متون کی تصحیح، ترتیب اور تحشیہ کے ضمن میں حسام الدین راشدی نے وہی جدید اصول اختیار کیے جو مغربی اسکالروں کے علاوہ جدید ایرانی محققین کا خاصہ رہا ہے۔ قانع ٹھٹھوی کے "مقالات الشعرا" اور خلیل ٹھٹھوی کے "تکملۂ مقالات الشعرا" بالترتیب ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئے۔ ان سے پیر صاحب اُن محققین کی فہرست میں شامل ہو گئے جو بہت معتبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مختصر بھی ہے۔ ان کے علاوہ تذکرہ شعرائے کشمیر (چار جلدیں)، تذکرہ جواہر العجائب، دیوان فخری اور دیوان بیرم خاں اردو میں دیگر تصانیف کے علاوہ میرزا غازی خاں ترخان اور اس کی بزمِ ادب سندھی میں مکلی نامہ (از قانع) اور تذکرہ مشاہیر سندھ (از مولوی وفائی) پیر صاحب کے مزاجِ تحقیق و تدوین و طباعت میں بھی نظر آتی ہے۔ بالکل ایران کی جدید کتابوں کی طرح ان کتابوں کی بھی آرائش و تزئین کی گئی ہے اور معیارِ تحقیق خاصا بلند رکھا گیا ہے۔

پیر صاحب کے بعض مضامین جو انھوں نے کسی ادیب یا محقق کی یاد میں لکھے ہیں یا پھر ان کی نجی محفلوں کی گفت گو سے ہمیشہ یہ خیال آیا کہ پیر صاحب کو اپنی خود نوشت سوانح حیات پر توجہ دینا چاہیئے۔ میں نے کئی بار اس ضمن میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ پیر صاحب کہتے: "ارے بھائی صاحب! ہم نے ایسا کیا تیر مارا ہے کہ اپنی زندگی کے حالات کو اس قابل سمجھیں کہ وہ کتاب کی شکل میں محفوظ رہے" ظاہر ہے کہ یہ ایک عالم کا انکسار تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے اپنی یادداشتیں کبھی زمانی تسلسل کے ساتھ قلم بند کی تھیں کہ نہیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ایک مخلص اور دردمند انسان کے توسط سے ہماری جدید تاریخ و تہذیب کا ایک اہم دور محفوظ ہو جاتا۔

مختلف ادبی شخصیتوں سے انھیں کس قدر محبت اور دلی لگاؤ تھا اس کا اندازہ ان کے ایک مضمون "پنبہ کجا کجا نہم" سے ہوتا ہے۔ خود اپنے بارے میں ۱۹۳۰ء کے حوالے سے یوں لکھا ہے:

"یہ اس وقت کی بات ہے جب میری تنخواہ کُل پچاس روپے تھی، یہ عدد در جسٹر

میں لکھا ہوا تو تھا لیکن یاد نہیں کہ یہ رقم مجھے کبھی بھی بہ یک وقت دیکھنا نصیب ہوئی ہو۔ کبھی ایک روپیہ اور کبھی آٹھ آنے ملا کرتے تھے۔ اور جب ایک دفعہ پونے پانچ روپے اکٹھے ملے تو اس کو بھی دُگنے کرانے کے ہوس میں رمو مکرانی کی پتّے بازی میں گنواں بیٹھا۔ ویسے کہنے کو تو میں سندھ کے ایک اہم اخبار کا مدیر سر دبیر تھا۔"

اس کے بعد نہایت محبت اور دردمندی سے سید ہاشمی فرید آبادی، سیماب اکبر آبادی، سید سلیمان ندوی، ارشد تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، نواب نثار یار جنگ، عطیہ فیضی، ہادی مچھلی شہری، ممتاز حسن اور شاہد احمد دہلوی کا تذکرہ کیا ہے۔

مجھ پر پیر صاحب کے کردار کی عظمت کا ایک گہرا تاثر ان کے آخری دورِ حیات میں قائم ہوا۔ وہ سخت بیمار تھے۔ کینسر کی تشخیص ہو چکی تھی۔ محفل آرائی اور شام کو "زیب النساء اسٹریٹ" کی رونق اور کتابوں کی دکانوں کا گشت موقوف ہو چکا تھا۔ لیکن جب کبھی ان سے ملاقات ہوئی اپنے مخصوص زیرِ لب تبسم کے سہارے نہایت حوصلہ اور تیقّن کے ساتھ زندگی کی مثبت باتیں کرتے تھے۔ دوسروں کی ہمت بندھاتے تھے اور ذرا دیر کے لیے بھی یہ تاثر نہ دیتے تھے کہ وہ زندگی کی آخری سانسیں شمار کر رہے ہیں۔

پیر صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

"زندہ رہنے والے مرنے والے کو قبر میں اتار کر جب تک پوری قبر اَٹ نہ جائے اس وقت تک مختلف ٹولیوں میں بٹ کر اپنی اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ کوئی کسی کے پیچھے نہیں گیا۔ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ دنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ دنیا کے کاروبار اور انسانوں کے مشاغل ویسے ہی جاری رہیں گے۔"

پیر حسام الدین راشدی کی فارسی تصانیف و تالیف کی تعداد چوبیس، اُردو کی چار اور سندھی میں بارہ ہیں۔ اُردو، سندھی اور فارسی زبان میں انھوں نے علم و ادب کے مختلف موضوعات پر جو مقالات لکھے ہیں ان کی تعداد تقریباً ساڑھے تین سو ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک درجن سے زائد فارسی اور سندھی کتابیں عمر کے آخری حصے میں زیرِ تالیف اور منتظرِ طباعت تھیں۔ کاش یہ سب کی سب پیر صاحب ہی کے معیارِ تحقیق و طباعت سے آراستہ ہو کر اہلِ علم کے مطالعے کے لیے سامنے آسکتیں۔

پیر حسام الدین راشدی کے سلسلے میں جو افراد یا ادارے اپنے اپنے انداز میں کام کر رہے ہیں وہ قابلِ تحسین ہے لیکن جس طرح وہ وقتی اور گروہی مصلحتوں سے آزاد تھے اسی طرح ان کی وسیع المشربی اور کشادہ نظری کی مثال قائم کرتے ہوئے کوئی ایسا کام کیا جائے کہ سب متحد ہو کر پیر صاحب کے خوابوں کی تعبیر تلاش کریں۔ اس ضمن میں میری تجویز یہ ہے کہ پیر حسام الدین راشدی کے نام سے ایک اکیڈمی اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جہاں پیر صاحب کی باقی ماندہ کتابیں، ڈائریاں، مسودات اور مطبوعات رکھی جائیں۔ ان کی ساری کتابیں ایک سیٹ کی شکل میں از سرِ نو شائع کی جائیں۔ جو مقالات منتشر ہیں انھیں مدوّن کیا جائے اور زیرِ طبع کتابوں کی جلد از جلد اشاعت عمل میں لائی جائے۔ نوجوان ریسرچ اسکالروں کو اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق اور فرہنگ شناسی کی تربیت اور سہولت مہیا کی جائے۔ پیر حسام الدین راشدی کی خدماتِ جلیلہ کے پیشِ نظر یہ سب کچھ انتہائی ضروری ہے۔ ان کی یاد اور ان کی علمی روش کو برقرار رکھنے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے موثر اور معتبر طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔

قومی زبان اور تعلیم

ڈاکٹر اسماعیل سعد

زبان یا بولنے کی صلاحیت ہیں، دوسرے حیوانوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔ یوں تو تمام حیوان اپنے گلے سے آوازیں نکالتے ہیں اور یہ صلاحیت ہم میں بھی موجود ہے لیکن دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں ہم کو اپنی آوازوں کے اتار چڑھاؤ پر بڑا قابو ہے۔ ہم اپنے منشا اور معنی کے اظہار کے لیے اپنی آوازوں کو ایک موثر وسیلہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ جب آوازیں مخصوص منشا اور معنی سے منسلک ہو جاتی ہیں تو ان کی حیثیت اور اہمیت علامتی ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ کسی مخصوص منشا یا معنی کی ترجمان بن جاتی ہیں آوازوں کا علامت بننا ایک تمدنی عمل ہے۔ جہاں تک آوازوں کے بس گلے سے نکلنے کا تعلق ہے یہ ایک جسمانی عضویاتی فعل ہے۔ لیکن ان آوازوں کا الفاظ اور جملوں میں ڈھل کر کسی شے یا خیال کی علامت بننا ایک تمدنی کارروائی ہے۔ چنانچہ زبان جسے ہم آپ بے تکلفی سے بولتے ہیں ہمارے لیے تمدنی زندگی کا تحفہ ہے۔ زبان محض یہی نہیں کہ تمدنی عمل کی پیداوار ہے بلکہ اس کی ضرورت کا احساس ہی تمدنی زندگی کا تقاضا ہے۔ اگر انسان کو معاشرے میں نہ رہنا ہوتا تو زبان کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی اور کسی ابتدائی سطح پر مافی الضمیر کا اظہار، جسمانی حرکات و سکنات یا آوازوں کے بے ترتیب اتار چڑھاؤ سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی تمدنی سطح پر معاشرتی زندگی کی ابتدا اور پھر اس کی تمدنی ترقی زبان کے وسیلے کے بغیر ممکن نہ تھی۔ زبان محض تمدنی زندگی کی بقا و ترقی کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ اپنے معاشرتی ماحول اور بیرونی دنیا سے داخلی طور پر افراد کو وابستہ رکھنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اسی سے ہمارے ذہنوں میں خیالات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور اسی سے ہماری پسند اور ناپسند کے معیار دل میں جڑ پکڑتے ہیں۔ ادب اور شاعری کی شکل میں اسی سے ہماری جمالیاتی حس متحرک رہتی ہے اور اسی کے ذریعہ ہم محض یہی نہیں کہ اپنے عمیق جذبات مثلاً محبت یا نفرت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ان کی شدت کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ غرض زبان ہمارے جذبات کا تاتا بانا بنتی ہے اور اپنے سے باہر جو کچھ ہے اس سے ذہنی و جذباتی طور پر ہمیں متعلق و وابستہ کرتی ہے۔ زبان کے ذریعہ ہم اپنے ادراک اور تعبیر کی حس کو اس طور پر بروئے کار لاتے ہیں کہ جن اشیا یا احساسات و تصورات کی الفاظ ترجمانی کرتے ہیں ان کی لفظی و علامتی شکل بجائے خود ہمارے لیے زندہ اور اصل حقیقت اختیار کر لیتی ہے۔ اور محض الفاظ ہی ہمارے ان تمام احساسات و کیفیات کو بیدار کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں جو اصل چیز کا مشاہدہ اور تجربہ ہمارے اندر پیدا کرتا ہے مثلاً گلاب

سے وابستہ تمام کیفیات یا ردعمل محض اس لفظ کے سننے سے ہمارے اندر بیدار ہو جاتے ہیں۔ صرف الفاظ کے ذریعہ سے ہی لیموں یا املی کے ذکر سے منہ میں پانی آنے لگتا ہے۔ مجرّد تصورات کے لیے زبان الفاظ کی شکل میں محض ہمیں ان کے معنی و مفہوم سے ہی آگاہ نہیں کرتی بلکہ ان معانی و مفہوم کو متعین بھی کرتی ہے اور زبان کا بہتر استعمال کرنے والے اشخاص اس سے ہر قسم کا فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ زبان کے بارے میں ان تفصیلات کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم یہ اچھی طرح جان لیں کہ زبان محض خیالات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اس سے ہمارا بہت گہرا ذہنی، جذباتی اور تمدنی رشتہ قائم ہے۔ اپنی اسی خاصیت کی بنا پر کسی معاشرتی گروہ کو جذباتی طور پر متحد رکھنے کے لیے ہم زبانی بے انتہا ضروری ہے۔ یہ جذباتی وابستگی جو فرد ایک دوسرے کے لیے محسوس کرتا ہے، محض ایک زبان بولنے تک ہی محدود نہیں، بلکہ ایک ہی زبان کے بولنے میں صرف لہجہ کے اختلاف سے بھی متحرک ہو جاتی ہے۔ زبان کے ذریعہ اس گہری وابستگی، ہم آہنگی اور قربت کو محسوس کرنے کی اگر کوئی منطقی وجہ ہے تو بس اتنی کہ ہر آدمی کے اندر اپنے تحفظ کی ایک فطری جستجو رہی ہے اور وہ اپنے آپ سے زیادہ مشابہت اور مناسبت رکھنے والے لوگوں کے ساتھ اپنے کو زیادہ محفوظ اور زیادہ بے تکلف محسوس کرتا ہے۔

پاکستان کو اپنی قومی زبان کے مسئلہ کو اسی پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یوں تو اردو کو بحیثیت قومی زبان کے تسلیم کیا جا چکا ہے۔ لیکن ہماری گزشتہ بیس سال کی ملکی تاریخ سے یہ واضح ہے کہ اردو کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں اختلافات بھی سامنے آئے ہیں اور نہ یہ قومی زبان کی کوئی اچھی خدمت ہوگی اور نہ ملک کی کہ ان اعتراضات کو پورے طور پر سمجھے بغیر اور معقولیت سے ان کا حل تلاش کیے بغیر ان کو بس نظر انداز کر دیا جائے اور کچھ جذباتی الزامات کی دھول اڑا کر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ختم ہو جائیں گے۔

ہمارا سب سے پہلا قومی اور تعلیمی مسئلہ انگریزی زبان اور اردو کے باہمی تعلق کا ہے۔ بعض لوگ یہ سنجیدگی سے محسوس کرتے ہیں کہ اپنی کم مائیگی کی بنا پر اردو زبان قومی زبان بننے کی متحمل نہیں ہو سکتی اور اب انگریزی کا کچھ اتنا چلن ہو چکا ہے اور اس کا بین الاقوامی تعلقات کو قائم رکھنے میں اتنا دخل ہے کہ انگریزی کو ہی قومی زبان بننا چاہیئے۔ اس نقطۂ نگاہ میں اس قدر حقیقت ضرور ہے کہ انگریزی زبان سے نہ تو دامن کشی ممکن ہے اور نہ ہی ایسا کرنا ہمارے حق میں ہے۔ محض یہی نہیں کہ بین الاقوامی زندگی میں یہ زبان ہمارے لیے رابطے کا کام انجام دیتی ہے بلکہ علمی دنیا سے اپنے تعلق کو قائم رکھنے کا یہی تنہا اور سب سے موثر ذریعہ ہمارے پاس موجود ہے۔ ویسے بھی آج کی دنیا کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ پڑھے لکھے آدمی کو ایک بین الاقوامی زبان میں مہارت بھی ہونی چاہیے اور اس کے لیے ہمارے اپنے حالات کے سیاق و سباق میں سب سے زیادہ مناسب زبان انگریزی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن انگریزی زبان کی اس تمام تر جائز اہمیت اور ضرورت کے باوجود اس مطالبہ کا کلّی جواز پیدا نہیں ہوتا کہ اس زبان کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ جیسا کہ اس سے پہلے وضاحت کی گئی ہے، زبان کا ایک اہم پہلو اس کی تمدنی اہمیت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انگریزی زبان اس مٹی کی پیداوار نہیں ہے جہاں ہم نے آنکھ کھولی ہے اور اس کے الفاظ محاورے اظہارِ خیال کے طریقے اور انداز کا خمیر اس معاشرت سے نہیں اٹھا ہے جو ہمارا اپنا تمدنی ورثہ ہے۔ دو سو سال کے تعلق کے باوجود ابھی تک انگریزی زبان

کے معیار کی کوئی ایسی روایت بھی نہیں بن پاتی ہے جس کو پاکستانی یا ہندی مکتبِ زبان کہہ سکیں۔ ہم کو اب بھی انگریزی زبان کے استعمال کے لیے جن معیاروں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جن اسناد کی طرف نگاہ ڈالنا پڑتی ہے وہ ہمارے ملک سے باہر مغربی ممالک بالخصوص انگلستان اور امریکہ ہیں۔

لیکن انگریزی زبان کے معاملے میں جو بات تمدنی پہلو کو اور بھی پیچیدہ کر دیتی ہے وہ ہے ہمارا وہ مخصوص نفسیاتی تجربہ جس سے اس زبان کے سیکھنے اور اس کے استعمال میں ہم گزرتے ہیں۔ اس زبان کے ساتھ ہمارا تعلق ایسا قدرتی یا فطری نہیں ہے جو کسی عام سیکھی جانے والی زبان کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ہمارے اور انگریزی زبان کے درمیان ان مخصوص سیاسی حالات نے جن میں ہم اس سے روشناس ہوئے، کئی نفسیاتی گتھیاں ڈال دی ہیں کیونکہ یہ زبان ہمارے مغربی آقاؤں کی زبان تھی اس لیے اس کے اور ہمارے درمیان ہمیشہ ایک نفسیاتی فصل رہا ہے۔ اور ہم نے اس کو کبھی برابری یا ہم سری کی سطح پر نہیں سیکھا۔ بلکہ ہمیشہ اس کے رعب میں رہے۔ ہم نے انگریزی زبان کو ہمیشہ ایک ایسی چیز خیال کیا کہ جو محض یہی نہیں کہ ہماری علمیت میں اضافہ کرتی ہو بلکہ ہمارے سماجی رتبہ کو بھی بلند کرتی ہے۔ آج بھی ہمارے مراعات یافتہ طبقے اپنے کو اس زبان سے پہچنواتے ہیں اور اس کی بنا پر اپنے کو امتیازی سلوک کا مستحق گردانتے ہیں۔ انگریزی زبان محض زبان ہی نہیں بلکہ بجائے خود تعلیم کا نشان بن گئی ہے اور ہم ہر اس شخص کو جو انگریزی بول لیتا ہے یا استعمال کر سکتا ہے بجائے خود تعلیم یافتہ بھی سمجھتے ہیں۔ اس زبان کے سلسلے میں ہم سب کی ذہنی کیفیت اس لطیفے میں منعکس ہوتی ہے جسے تمام لطیفوں کی طرح خواہ مخواہ ایک ایسے صاحب سے وابستہ کر دیا ہے جو تازہ تازہ انگلستان سے واپس آئے تھے اور جب ان سے وہاں کی تعلیم و ترقی کے بارے میں پوچھا گیا تو بے ساختہ کہہ اٹھے کہ وہاں کی تعلیم و ترقی کا تو یہ حال ہے کہ بالکل چھوٹے چھوٹے بچے بھی انگریزی بولتے ہیں۔

انگریزی زبان کو تعلیم اور ترقی کے ہم معنی سمجھنا صرف کسی ایک سادہ لوح ذہن کی بات نہیں ہے بلکہ بہ حیثیت قوم ہم سب اس احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ انگریزی زبان کے بارے میں ہمارے ذہنی ردعمل کے صحیح ہونے میں ابھی ایک عرصہ لگے گا۔ اس لیے کہ ہنوز ہمارے حکمراں طبقے اس کو اپنے رہن سہن کی شان سمجھتے ہیں اور عام اور غریب لوگوں سے اپنے کو الگ رکھنے کے لیے امتیازی نشان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان کے سلسلے میں ہماری ذہنی اور نفسیاتی صورتِ حال کم و بیش یہی ہے جس کا میں نے نقشہ کھینچا ہے تو پھر اس زبان کا قومی زبان بننا اس ملک کے حق میں نیک فال نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ زبان ابھی تک طبقاتی ناہمواریوں کو پختہ تر کرنے کا وسیلہ بنی رہی ہے اور اپنی اس ڈگر کو چھوڑ کر ملک کے لوگوں کو جذباتی و تمدنی طور پر ایک دوسرے سے قریب کرنا اس کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

قومی زبان کے لیے دوسرا بڑا اہم مسئلہ دوسری صوبائی زبانوں سے اس کا ربط ہے۔ اس ملک کی مختصر سی تاریخ میں ایسے ناخوش گوار سانحات بھی گزرے ہیں جن کو لسانی فسادات کا نام دیا گیا ہے۔ بنگلہ دیش کی تشکیل سے پہلے پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک بڑی وجہِ نزاع لسانی آویزش بھی رہی ہے۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کے باوجود ملک کے بعض حصوں، خصوصاً صوبہ سندھ میں لسانی فسادات کی آگ بھڑکی اور ابھی اس کی چنگاریاں شاید پوری طرح سرد نہ ہوئی ہوں، لیکن لسانی آویزشوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس نکتہ کو پوری طرح سمجھ لیں کہ

لڑائی دراصل دونوں زبانوں کے بیچ میں نہیں ہوتی بلکہ دو مختلف زبان بولنے والوں کے درمیان ہوتی ہے جو جائز یا ناجائز یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ زبان کی بنا پر کیونکہ گروہ بندی آسان ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ جھگڑا لسانی ہے، حالانکہ اصل وجہِ نزاع بالکل مختلف ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں جھگڑنے والے فریقین میں سے غلطی دونوں کی ہوتی ہے اس لیے کہ کوئی تالی صرف ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ہمارے یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف لسانی گروہ ابھی تک ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر نہیں ہو سکے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی محرومیوں کا الزام ایک دوسرے پر ہے اور اپنے تعصبات اور مفاہمت کی اس کمی کو زبان کا نقاب اوڑھا کر اسی کو نزاع کی اصل وجہ سمجھ لیتے ہیں۔ اگر اس ملک کی صرف ایک زبان ہوتی لیکن طبقاتی یا علاقائی ناہمواریوں کا یہی حال ہوتا جو اب ہے تو معاشرتی شورشیں اور آویزشیں ختم نہیں ہوتیں بس نئے بہانے تلاش کر لیتیں۔ جھگڑے کی اصل وجہ زبان نہیں ہے بلکہ وہ غیر تسلی بخش حالات ہیں جو انسانوں کو مختلف گروہوں میں بٹنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ مسئلہ پورے طور پر تو جب ہی حل ہو گا جب زندگی کے مختلف شعبوں میں علاقائی ناہمواریوں اور عدم توازن میں کمی آئے گی لیکن عبوری مرحلہ کے لیے صرف زبان کی سطح پر کچھ اقدامات ایسے ضرور کیے جا سکتے ہیں کہ جن سے لسانی آویزش کی فضا میں کسی حد تک کمی آ سکے۔ ان میں سب سے اہم قدم تو یہی ہے کہ صوبائی زبانوں کو وہ تحفظ حاصل ہو جو ان کے فروغ اور ترقی کے لیے ضروری ہو اور جو کسی حد تک اس اندیشے کا ازالہ کر سکے کہ کسی مخصوص زبان کے بولنے والوں کی تمدنی ترقی میں کوئی خلل واقع ہو سکتا ہے۔ دراصل قومی زندگی میں یہ نکتہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے فروغ کی بنیاد یکسانیت نہیں بلکہ تمدنی تنوع پر ہونی چاہیے اور کسی بڑی اکائی کا حصہ بننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام چھوٹی اکائیاں سرے سے غائب ہو جائیں۔ اگر آدمی ملک سے محبت کرتا ہو تو پھر خاندان سے اس کا لگاؤ کم ہو جائے۔ دراصل بڑی اکائی سے وفاداری اسی وقت قدرتی اور مضبوط ہو سکتی ہے جب یہ وفاداری نچلی سطح کی وفاداریوں سے منسلک اور ہم آہنگ ہو۔ ہاں بس کوشش یہ ہونا چاہیے کہ ادنیٰ اور اعلیٰ وفاداریاں ایک دوسرے سے متصادم نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے کے لیے توانائی اور مضبوطی کا ذریعہ ہوں۔

انگریزی زبان اور صوبائی زبانوں کے ضمن میں اردو کا بہ حیثیت قومی زبان جو رشتہ ہے اس کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت اسی لیے تھی کہ تعلیمی نظام کے نقطۂ نگاہ سے اور تعلیمی لحاظ سے دو اہم اعتراضات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ ان میں ایک تو یہی ہے کہ اردو زبان اتنی زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے اور جب تک کہ زبان ترقی نہ کر لے اس کے نفاذ سے نظامِ تعلیم کو دھکا لگے گا اور تعلیم کا معیار انتہائی حد تک گر جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ اردو زبان انگریزی زبان کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ ہے اور یہ بات بھی ہے کہ ابتدائی مرحلوں میں کچھ قربانیاں دینی پڑیں گی۔ اور اس کا اندیشہ ہو سکتا ہے کہ شروع میں معیارِ تعلیم پر کچھ اثر پڑے لیکن یہ بہت کم قربانی ہو گی۔ ملک و قوم کے دور رس مستقبل کے نقطۂ نگاہ سے پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ معیارِ تعلیم کے گرنے کی اگر کوئی وجہ ہے تو یہ نہیں کہ ایک مدرسے میں انگریزی میں تعلیم ہوتی ہے اور دوسری جگہ اردو میں بلکہ یہ کہ اپنی سہولتوں اور دیگر لوازمات کو دیکھتے ہوئے انگریزی اسکول اردو اسکول کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور آسودہ حال ہوتا ہے۔ اصل فرق زبان کا نہیں بلکہ حیثیت و مرتبے کا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں

طبقہ واری ناہمواری کم ہو اور بہتر تعلیم صرف مراعات یافتہ طبقہ کی اجارہ داری بن کر نہ رہ جائے تو ہمیں تعلیمی مواقع کو عام کرنا ہوگا جو تعلیمی وسائل آج صرف گنے چنے مدارس تک محدود ہیں۔ انہیں اردو زبان کے مدارس تک بھی پہنچانا ہوگا اور تعلیمی مفلسی کے سمندر میں خوش حالی کے جو چند جزیرے نظر آرہے ہیں۔ ان کی تعداد میں مزید اضافہ کرنا ہوگا۔ جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ اردو زبان کم ترقی یافتہ ہے تو اس بات کا کسی حد تک اعتراف کرنے کے باوجود یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے یہ زبان اتنی کم مایہ بھی نہیں کہ اس کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جاسکے۔ دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ابتدائی و ثانوی مدارس کی سطح پر اور عثمانیہ یونیورسٹی و کن میں اعلیٰ و پیشہ ورانہ تعلیم کی سطح پر اس سلسلے میں جو تجربات کیے گئے ان کے نتائج محض یہی نہیں کہ حوصلہ شکن نہ تھے بلکہ امید افزا تھے۔ اس بات کا تعلیمی اعتراف کرنا ہوگا کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی سطح پر اردو زبان میں پورے اطمینان کے ساتھ پڑھایا جاسکتا ہے اور بچے کی تعلیمی استعداد پر اس کا مثبت اثر مرتب ہوگا۔ یہ بات حتمی طور پر اعلیٰ تعلیمی مدارج کے لیے نہیں کہی جاسکتی اور اس سطح پر اردو کے ساتھ انگریزی کا استعمال بھی ضروری ہے لیکن اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اردو زبان میں مزید علمی کام کرنے کی ضرورت ہے اور بین الاقوامی سطح پر علم میں اضافے اور پھیلاؤ کے ساتھ اردو زبان کی علمی استعداد میں وسعت کی ضرورت ہے، لغات کی تدوین کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو میں مزید تراجم کی ضرورت ہے۔ حوالہ جاتی کتابوں کی تیاری کی ضرورت ہے۔ نئی نئی کتابوں کی ضرورت ہے۔ علمی رسائل و جرائد کی ضرورت ہے۔ اور یہ کام صرف کرنے سے ہوسکتا ہے اس کے سلسلے میں جس صبر طلب محنت کی ضرورت ہے وہ صرف حکومت کا کام نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ہم سب کو قبول کرنی ہوگی۔ اور انفرادی و اجتماعی سطح پر اردو زبان کی علمی خدمت انجام دینا ہوگی۔

تعلیمی لحاظ سے دوسرا اہم اعتراض جس کو صوبائی زبانوں کے حوالے سے پیش کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اردو کا اس ملک کے کسی خطّے سے زمینی تعلق نہیں ہے اور یہ صرف رابطہ کی زبان ہے۔ یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ اردو پاکستان کے کسی خاص خطّے سے وابستہ نہیں اور اسی لیے اس کی حیثیت ملک کی بیشتر آبادی کے لیے مادری زبان کی نہیں ہے اور اس لحاظ سے ابتدائی تعلیمی مرحلے میں اس زبان کی وہ اہمیت نہیں ہوسکتی جو مادری زبان کی ہے۔ مادری زبان اور دوسری زبانوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ بچہ مادری زبان کو سیکھتا نہیں بلکہ جذب کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو محض مادری زبان سے ایک ذہنی لگاؤ اور موانست ہی نہیں ہوتی بلکہ زبان کے استعمال سے تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار اور ترقی میں بچے پر کوئی غیر ضروری بوجھ نہیں پڑتا اور اپنے ماحول سے واقفیت اور اس کے ادراک میں ایک بے تکلفی اور قدرتی پن رہتا ہے۔ لیکن اس سے جو تعلیمی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ یہی کہ ابتدائی تعلیم کی منزل میں بچہ کی مادری زبان کو ضرور استعمال کیا جانا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مادری زبان کے ساتھ کوئی دوسری زبان شاملِ نصاب نہ ہونا چاہیے، یا یہ کہ وہ ذہن پر زبردست قسم کا دباؤ ڈالے گی۔ اوّل تو یہ ہے کہ بچے کی صلاحیتوں کے سلسلے میں ہمارا اندازہ اتنا صحیح نہیں ہوتا جب ہم اپنی زبان سیکھنے کی صلاحیت کا موازنہ بچہ سے کرتے ہیں۔ بچہ میں بڑوں کے مقابلے میں زبان سیکھنے کی کہیں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور وہ بآسانی کم از کم دو یا تین زبانوں کو لے کر چل سکتا ہے اور پھر صوبائی زبانوں اور اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اتنا اشتراک ہے اور ہر علاقے میں اردو زبان اتنی سمجھی جاتی ہے کہ بچے کا ذہن اس سے اتنی اجنبیت محسوس نہیں کرتا جتنی کسی دوسری بیرونی زبان سے۔

دراصل پاکستان میں کسی مخصوص خطے سے عدم وابستگی قومی زبان کے سلسلے میں اردو کے حق میں جاتی ہے ورنہ مخصوص گروہی مفادات مختلف صوبوں کے درمیان لسانی رشتوں کو پیچیدہ تر بنا دیتے۔

اردو پاکستان کی تشکیل سے پہلے بھی برصغیر کے مسلمانوں میں اشتراک کا ایک ذریعہ تھی اور یہی بات اب پاکستان کے مختلف خطوں کے درمیان بھی ہے۔ اردو اچھی خاصی ترقی یافتہ زبان ہے اور یہ زبان مختلف گروہوں کے درمیان رابطے کا کام بخوبی اور موثر طور پر انجام دے سکتی ہے۔ لیکن دراصل قومی زبان کے لیے اردو کا استحقاق سیاسی جدوجہد کی اس تاریخ سے وابستہ ہے جو پاکستان کی تشکیل کا پیش خیمہ تھی۔ پاکستان کی تخلیق سے پہلے برصغیر کے مسلمان جس تمدنی ورثہ کو اپنے لیے قدر مشترک خیال کرتے تھے۔ اردو زبان نے اسے نکھارنے، سنوارنے اور اس کی شیرازہ بندی میں بڑا اہم کام انجام دیا۔ اس زبان نے مسلمانوں کو بہ حیثیت قوم ایک تشخص دیا اور تحریک پاکستان کے لیے علامت بن گئی۔

یہ بات تو اپنی جگہ اہم ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ تشخص دینے میں اور پاکستان کی سیاسی جدوجہد میں اردو زبان نے اہم کردار ادا کیا لیکن تعلیمی لحاظ سے اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اس ملک کو مضبوط اور متحد رکھنے کے لیے قومی زبان کی حیثیت سے یہ کام انجام دے سکتی ہے۔ تعلیم، جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے اپنی ماہیت میں ایک معاشرتی عمل ہے۔ ہر معاشرے کو اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے دو بنیادی کام انجام دینے ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنے کو باقی رکھنے کا اور دوسرا بدلتے ہوئے حالات میں مناسب تبدیلیاں پیدا کرتے ہوئے اپنے فروغ کا اہتمام کرتے رہنے کا۔ تعلیم کا بنیادی کام بھی سماج کی انھیں دو کارروائیوں سے عبارت ہے۔ سماج کو متحد رکھنے کا کام جذبات کے اس نظام پر ہوتا ہے جو اس کے افراد کے درمیان مشترک ہوتا ہے۔ یہی جذبات جو سماج کی مختلف محسوس اور غیر محسوس اشیاء سے وابستہ رہتے ہیں اور جن کو معروضی اصطلاح میں "معاشرے کی قدریں" کہا جاتا ہے۔ سماج کے افراد کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور وابستہ رکھتے ہیں۔ اور کسی سماج کو اس کی مخصوص قومی شخصیت عطا کرتے ہیں۔ تعلیم کا کام ان خدمات اور قدروں کو سماج کے افراد بالخصوص نئی نسلوں میں زندہ رکھنا اور نکھارنا ہوتا ہے۔ اس تعلیمی وظیفے میں زبان بالخصوص قومی زبان کا کردار بہت اہم ہو جاتا ہے۔ زبان یوں بھی ہمارے جذبات کا حصہ ہے اور ہمارا ایک قیمتی تمدنی سرمایہ ہے اور پھر بہ حیثیت ابلاغ کے موثر وسیلہ کے یہ سماج کی دوسری قدروں کو زندہ و متحرک رکھنے کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ پاکستان کے باشندے یوں تو ایک ہی ملک کے شہری ہیں اور ان میں بنیادی قومی وابستگیاں ہیں لیکن ایک مضبوط اور متحد قوم ہونے کے لیے ابھی طبقاتی اور علاقائی سطحوں پر انھیں کئی ناہمواریوں کو ختم کرنا ہے اور ملکی زندگی کے لیے وہ ہم آہنگی پیدا کرنا ہے جس میں ہر شخص کو یہ محسوس ہو کہ پاکستانی سماج کو اس کی ضرورت ہے اور اس سماج میں اس کی ایک باعزت جگہ اور حیثیت ہے اس ہم آہنگی کو پیدا کرنے کے لیے کچھ مدت درکار ہوگی اور اس دوران ہمارے تمدنی سفر کی سمت کو ہمارا تعلیمی نظام اور بالخصوص قومی زبان کے سلسلے میں ہماری حکمت عملی متعین کرے گی۔

معاشرتی زندگی کا دوسرا بنیادی تقاضا، یعنی بدلتے ہوئے حالات میں قومی ترقی اور فروغ کا اہتمام بھی دراصل تعلیم کی ذمہ داری ہے اس لیے کہ تعلیم ہی ان نئی نسلوں کی پرورش و پرداخت کرتی ہے جو ملک کو مسلسل چلاتے رہنے کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ اس ذمہ داری کا تعلیمی تقاضا یہی ہے کہ طالب علموں کو علمی تحصیل کے بہتر سے بہتر مواقع حاصل ہوں اور ان کی

تخلیقی صلاحیتوں کی نگہداشت اور آبیاری کا پورا انتظام ہو۔ یہاں بھی تعلیمی نظام میں قومی زبان کی مرکزی اہمیت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بہ حیثیت ذریعہ تعلیم کے زبان دوسرے تمام علوم و فنون کو متاثر کرتی ہے اور ان پر حاوی رہتی ہے۔ زبان کی تدریس جتنی زیادہ موثر ہوگی اور خود زبان میں علمی ترقی کرنے کی جتنی صلاحیت ہوگی اتنا ہی تعلیمی معیار بہتر ہوگا اور طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں پر خوش گوار اور خوش آئند اثر پڑے گا۔ اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اردو زبان کو بھی ترقی کی اشد ضرورت ہے اور تعلیم کی ثانوی اور ابتدائی سطحوں پر بھی علمی مواد کو مرتب کرنے اور نئی نئی کتابیں لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ تعلیمی نظام کو صحیح خطوط پر چلانے کی ایک ذمہ داری تو حکومت کی ہوتی ہے۔ وہ تعلیمی حکمت عملیوں کو متعین کرتی ہے اور قومی زبان کے بارے میں بھی تعلیمی حکمت عملی کو مرتب کرنے کی ذمہ داری بنیادی طور پر حکومت کی ہے لیکن پچھلے تیس برسوں میں متضاد سیاسی اور سماجی مفادات نے جس طرح حکومت کی سطح پر ہماری تعلیمی حکمتِ عملی کو متاثر کیا ہے۔ اس کے منظر اور نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن حکومت اگر خلوص دل اور نیک نیتی سے بھی کچھ کرنے کی کوشش کرے تو بھی ملک کے لوگوں کے لیے اس کی حیثیت احکام کی بجا آوری سے زیادہ نہیں ہوتی اور اس کا داخلی احساس ہم تک نہیں پہنچ پاتا۔ لیکن جمہوری معاشرے میں ملکی زندگی کو چلانے کی اصل ذمہ داری عام آدمی کی سطح پر ہوتی ہے۔ عام آدمی اس ذمہ داری کو کس حد تک قبول کرتا ہے اور انجام دیتا ہے یہی حقیقت معاشرے کے جمہوری معیار کا پیمانہ بنتی ہے۔ تعلیمی نظام میں قومی زبان کی ترویج کی ذمہ داری اگر کسی حد تک حکومت کی ہے تو اس کی زیادہ تر ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ وہ براہِ راست بچوں کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر وہ خود زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں، خود اچھی زبان بولتے اور لکھتے ہیں، اپنی تدریسی اہلیت کا محاسبہ کرتے ہیں، اپنی تدریسی ذمہ داریوں کو محنت اور خلوص سے انجام دینے کی عادت ہے، زبان کے بارے میں ایک معروضی نکتۂ نگاہ ہے۔ اپنے ملک اور ملک کے بسنے والوں سے محبت ہے تو ہمارے طالب علم محض یہی نہیں کہ ان سے صحت مند اثر لیں گے بلکہ ان میں اپنی قومی زبان سے جذباتی وابستگی بھی پیدا ہوگی اور وہ موثر طور پر اس زبان کو علمی تحصیل کا ذریعہ اور علم کی افزائش کا وسیلہ بنائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ محض قومی زبان ہی کا نہیں بلکہ خود ہماری قوم کی قسمت کا فیصلہ بھی ہمارے مدرسوں میں اور ہمارے آپ کے ہاتھوں سے ہوگا۔

اسلوبیاتِ میر

میر کا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قیمت: ۲۰ روپے

نفاذِ اسلام کی جانب پیش قدمی

'پاکستان میں انوسٹمنٹ بینکنگ کا رہنما ادارہ'

آئی سی پی ملکی معیشت کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کے سلسلے میں درج ذیل پر خلوص اقدامات پر خوشی محسوس کرتا ہے۔

- صنعتی ضروریات کے لئے سرمایہ اب بلاسودی "میعادی شراکتی سرٹیفکیٹس" کے تحت فراہم کیا جاتا ہے۔
- "انویسٹرز اسکیم" کے تحت نفع نقصان کی بنیاد پر شراکتی کھاتے کھولنے کی سہولت۔
- میوچل فنڈز اور اسٹیٹ انٹرپرائز میوچل فنڈ سیریز "اے" کی سود سے پاک نفع بخش سرمایہ کاری میں تبدیلی۔

انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان

منافع بخش سرمایہ کاری کا وسیع تجربہ

کراچی • لاہور • راولپنڈی • کوئٹہ
پشاور • فیصل آباد • ملتان • حیدرآباد • اسلام آباد

-84- R ICP PID Islamabad

گلہائے رنگ رنگ

پشتو

گجرے

مصنف: قلندر مہمند، ترجمہ: طاہر آفریدی

جیسے ہی شیر دل تالاب والے کھیت سے مڑ کر ٹاپو کے قریب پہنچا تو شیرینہ کی رونے کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی!

"نہ جانے شیرینہ کیوں رو رہی ہے؟ شاید اُسی پرانی بات کو یاد کر کے رو رہی ہے"

اس نے خود سے کہا۔ "بچی ہے، اور بچے جس بات پر ضد پکڑ لیں تو اسی کو بار بار یاد کرتے ہیں"

اس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھائے اور گاؤں کی طرف دیکھنے لگا جہاں "ایک آدھے گھر" سے دیے کی مدھم روشنی شیرینہ کے رونے کی آواز کے ساتھ اس تک پہنچ رہی تھی۔ اس نے اٹکل سے روشنی اور رونے کی آواز کے سہارے نظریں دوڑائیں تو اپنے گھر کے آنگن میں اسے شیرینہ نظر آگئی۔

"بابا! میرے لیے گجرے لے آئے؟" معصوم شیرینہ اس کے پیروں سے لپٹ گئی۔

"بیٹی جب شہر جاؤں گا تو گجرے کیا ساتھ ساتھ چوڑیاں بھی لاؤں گا"

"نہیں! نہیں ابا مجھے بس گجرے ہی لا دو" شیرینہ کی آواز میں مدت سے گندھی ہوئی گجروں کی خواہش زخمی ہو کر اُس سے لپٹ رہی تھی اور شیرینہ آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔

"بیٹی! اب چپ بھی کرو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ شہر جا کر گجرے ضرور لاؤں گا"

شیر دل کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شیرینہ سے کسی نہ کسی طرح جان چھڑانا چاہتا ہے۔

"تو کب لاؤ گے؟"

"جب شہر جاؤں گا" اُس نے تمام چھوٹ کو پدرانہ شفقت میں لپیٹ کر بڑی نرمی سے کہا۔

"نہیں ابا! جھوٹ بول رہے ہو۔ آپ میرے لیے گجرے نہیں لاؤ گے"

معصوم شیرینہ نے باپ کی شفقت اور جھوٹی تسلی پر یقین نہ کیا اور وہ ہچکیاں لینے لگی۔ شیر دل پر یکایک غصے کا جن سوار ہو گیا اور اس نے معصوم شیرینہ کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور مجنونانہ انداز میں گھر سے نکل کر بیری کے درختوں کے جھنڈ

کی طرف چلا گیا۔ چند قدم چل کر اسے خیال آیا۔

"اس میں بیچاری شیرینہ کا کیا قصور تھا؟ میں نے اسے کیوں مارا؟ اف یہ میں نے کیا کیا! میں کیا پاگل ہو گیا؟"۔

اس کی سوچ میں پشیمانی کے کانٹے چبھنے لگے۔

"خدا جانے عورت ذات کے لیے گجرے اتنے زیادہ پسندیدہ کیوں ہوتے ہیں!" اس کی سوچ نے تحت الشعور کی البم کھول کر اس میں سے دو تصویریں نکال لیں۔ ..... آج سے سات سال پہلے شام کے جھٹ پٹے میں وہ قلبہ (ہل اور بیلوں کی جوڑی) لے کر تھکا ماندہ کھیتوں سے آیا تھا اور شیرینہ کی ماں نے جو اس وقت تک شیرینہ کی ماں نہیں بنی تھی، اسی طرح ضد کے ساتھ گجروں کا تقاضا کیا تھا۔ لیکن اس وقت اسے ریشمینہ پر نہ تو غصّہ آیا تھا اور نہ اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ تو پھر آج اس کے حواس پر غصّے کی چیونٹیاں کیوں رینگنے لگی تھیں؟" اس نے خود سے پوچھا۔ مگر جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو خود سے شرمندہ ہو کر مسکرانے لگا۔ لیکن گاؤں کے دروازوں اور گلیوں سے نکلتی ہوئی شیرینہ کی رونی آواز نے اس کی مسکراہٹ کو اتھل پتھل کیا اور اس کا ذہن پھر کانٹے دار تاروں میں الجھ گیا ..... شیر دل جب کھیتوں میں پنجوں پر بیٹھ کر درانتی پکڑے فصل کاٹ رہا تھا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے شیرینہ کھیت کی منڈیر پر کھڑی ہو اور کہہ رہی ہو کہ:

"بابا! میرے گجرے"

وہ منہ پھیر کر سامنے دیکھنے لگا۔ دوسری طرف بیری کے درخت کے پتوں کے درمیان چاند کی نرم دودھیا روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"! آج چاند کی کونسی رات ہوگی؟" اس نے خود سے پوچھا اور جواب دینے کے لیے خود کو تیار کرنے کی غرض سے چاند کو دوبارہ دیکھا تو اسے شیرینہ کے رخساروں پر آنسوؤں کے بہتے قطرے یاد آئے اور اسے محسوس ہوا جیسے چاند بھی ایک ٹوٹا ہوا گجرا ہو۔ اس نے منہ میں آئے ہوئے تھوک کو نگل لیا اور آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو آنکھوں میں سمیٹ کر درانتی تیز تیز چلانے لگا۔ وہ درانتی چلاتا رہا، فصل کاٹتا رہا مگر اسے ہر ساعت شیرینہ یاد آتی رہی اور وہ خود کو شرمندہ شرمندہ محسوس کر رہا تھا۔

"گجرے اتنے مالیت کے تو نہیں ہو سکتے جو میں شیرینہ کے لیے خرید نہ سکوں، مگر کس طرح؟" اس نے سوچا۔ "شہر میں جا نہیں سکتا اور ....." اس کے ساتھ ہی اس کے وجود میں رگیں کھنچ سی گئیں اور ہونٹ کپکپانے لگے۔ اس نے درانتی ایک طرف زور سے پھینک دی اور اِدھر اُدھر نظریں گھما کر دیکھا۔ خاموشی ہر سُو چھائی ہوئی تھی۔ البتہ جھینگروں کی آواز اس خاموشی کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دور گاؤں کی طرف سے ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر ساز و آواز کا ایک ٹکڑا شیر دل کے کانوں میں زہر گھولنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ خان کے حجرے میں آج پھر کوئی محفل جمی ہوگی، یا پھر ریڈیو زور زور سے بج رہا ہوگا۔ نہ جانے شیر دل کو موسیقی کی ان لہروں پر غصّہ کیوں آنے لگا۔ اور جب اس ساز و آواز کے ساتھ ایک زوردار قہقہہ بھی آنے لگا تو شیر دل کے منہ سے ایک موٹی گالی نکلی اور وہ زمین پر زور سے تھوک کر کٹے ہوئے گندم کے خوشوں کو حقارت سے دیکھنے لگا۔

"خان کسی نہ کسی طرح ہمیں ان زمینوں سے بے دخل کر رہے ہیں۔ اس کی..... اور اس نے ایک اور گالی دی اور بکھری ہوئی فصل کو جمع کرنے لگا۔

جب وہ گٹھا باندھنے کے لیے گندم کے خوشوں سے رسّا بنانے لگا تو اسے شیرینہ کے گجرے اس بری طرح یاد آئے کہ وہ کٹی فصل کو ایسے ہی چھوڑ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

شیر دل جب گاؤں کی گلی سے گزر رہا تھا تو اسے محسوس ہوا کہ سارا گاؤں اطمینان اور سکون کی چادر اوڑھے سو رہا ہے۔ وہ تنگ گلیوں سے گزر کر گھر کے کھلے دروازے میں داخل ہوا۔ گھر کے تمام لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ وہ شیرینہ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور پھر جھک کر اسے چومنا چاہا مگر شیرینہ نے نیند میں ایک ایسی ہچکی لی کہ اس کا دل گیلے کپڑے کی طرح نچڑ سا گیا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور نیلے آسمان پر جھلملاتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے شیرینہ کے گجروں کے بارے میں سوچنے لگا۔ مگر اس کا ذہن سوچتے سوچتے دکھنے لگا۔

"شیرینہ کے لیے اگر گجرے نہ لاؤں تو وہ ننھی سی جان اس غم میں گھُل کر مر جائے گی۔ اگر شہر جاتا ہوں تو.....،، اور تو کے بعد ہی اس کا ذہن الجھ جاتا تھا۔ "یرہ بس! ایک تو ذاتِ خدا بہتر ہوتی ہے۔ اگر میں اکیلا نہ ہوتا تو یہ خوف بھی نہ ہوتا کہ میری غیر موجودگی میں خان میرے بچوں کو گھر سے نکال دے گا۔" وہ اسی شش و پنج میں پتہ نہیں کس وقت سو گیا۔

فجر کی اذان کے ساتھ ہی وہ اٹھا اور چادر کندھے پر رکھ کر درانتی اٹھالی اور چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ وہ معصوم شیرینہ سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ اور جب سورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد اس کے گوانڈی (پڑوسی) کا لڑکا اس کے لیے "چائے جوش" بیں چائے لے آیا تو اس نے دور ہی سے دیکھا کہ شیرینہ روٹی کا رومال سر پر رکھے تھکے تھکے قدموں سے آ رہی تھی شیرینہ کو آتے دیکھ کر اس کے بدن پر گرم سیسہ پھیلنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھا، مگر جب وہ شیرینہ کے قریب پہنچا تو یہ گرم سیسہ اس کی آنکھوں میں پھیل گیا۔ اس نے شیرینہ کو گود میں اٹھالیا۔

"میری بچی!،، یہ لفظ بہ مشکل اس کے منہ سے نکلا اور گرم سیسہ آنکھوں سے بہنے لگا۔ جب وہ چائے پینے لگا تو شیرینہ گندم کے خوشے توڑ توڑ کر اپنے لیے گجرے بنا رہی تھی۔ شیر دل نے اسے دیکھا تو چائے کا گھونٹ اس کے گلے میں اٹک گیا اور اس کے بدن پر زہریلی چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

"شیرینہ بیٹی! یہ برتن اٹھالو،، اس نے مونچھوں کو دامن سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ شیرینہ کچھ کہے بغیر برتن اٹھانے لگی شیر دل نے اس کے معصوم چہرے کو دیکھ کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میری بچی کل جمعہ کو شہر ضرور جاؤں گا اور تیرے لیے گجرے لاؤں گا۔ اچھا اب جاؤ گھر چلی جاؤ۔"

شیرینہ نے ایک نظر باپ پر ڈالی اور برتن لے کر گھر کی طرف جانے لگی.....

جب صبح شیرینہ اٹھی تو گاؤں بھر میں ایک الغاؤ تلغاؤ (شور شرابہ) مچا ہوا تھا۔ ہر گھر سے رونے چیخنے کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ شیرینہ کی ماں ایک طرف بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

"اماں! ابا کہاں ہے؟" شیرینہ نے بڑی بے صبری سے ماں سے پوچھا۔

"حجرے میں بیٹھا ہے۔" ریشمینہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور شیرینہ دوڑ کر گلی سے نکل گئی۔ حجرے کے دروازے پر پہنچ کر اسے اپنا باپ نظر آیا۔ وہ دوڑ کر شیر دل کی گود میں بیٹھ گئی اور بڑی معصومیت اور بے صبری سے پوچھا۔ "شہر کب جاؤ گے بابا؟"

"بیٹی بس اب جا ہی رہا ہوں"، شیر دل نے چادر سے ہاتھ نکالے اور چاہا کہ شیرینہ کے سر پر پھیرے مگر پھر جلدی سے اسے چادر کے اندر چھپانے لگا۔ مگر شیرینہ نے اس کے ہاتھ دیکھ لیے اور کچھ اٹھلا کر چادر سے شیر دل کے ہاتھ کھول کر بولی۔

"خود کیسے اچھے گجرے پہنے ہیں۔ میرے لیے بھی تو ایسے گجرے لاؤ نا۔ مگر اس کے ساتھ یہ لوہے کی زنجیر نہ ہو۔"

بیٹی کی معصوم بات سن کر شیر دل اتنے زور سے ہنسا کہ اس کی سانس بھول گئی۔ اور وہ دیر تک کھانستا رہا۔

دسویں صدی ہجری کی ادبی روایات کا سراغ

دیوان حسن شوقی

مرتبہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ کراچی نمبر

طنزیات و مقالات

از: سیّد محفوظ علی بدایونی ۔ مولف: محمد محی الدین بدایونی بی اے

قیمت: بیس ۲۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ بابائے اُردو روڈ، کراچی ۱

گلہائے رنگ رنگ

سندھی

شاہ جو رسالو ــــ تصنیف و تالیف

ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی۔ ترجمہ: رحمت فرخ آبادی

شاہ عبداللطیف بھٹائی جب حالتِ وجد میں آتے تو بے اختیار شعر کہتے جنھیں اسی وقت ان کے فقرا لکھ لیتے تھے۔ مولانا جلال الدین رومی بھی اسی طرح شعر کہتے تھے جنھیں ان کے مرید اور دوست حسام الدین چلپی لکھ لیا کرتے تھے۔ عام اعتقاد یہ ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اپنے کلام پر مشتمل تین جلدیں جھیل کرار میں پھینک دی تھیں کیونکہ انھیں خدشہ تھا کہ شاید لوگ ان کے معنوی کلام کی رمزیت کو نہ سمجھ سکیں اور نتیجے کے طور پر گمراہی میں مبتلا ہو جائیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ ان جلدوں کا ایک آدھ نسخہ کسی فقیر کے پاس رہ گیا تھا اور کچھ کا خیال ہے کہ ان جلدوں کے ضائع ہونے پر شاہ کے مریدوں اور فقیروں نے واویلا مچائی چنانچہ شاہ لطیف کو رحم آگیا اور انھوں نے اپنی ایک مرید مائی نیامت (نعمت) کو جسے بیشتر کلام دیا تھا کہا کہ وہ فقیروں کو ان کا کلام تحریر کرا دے۔ جب یہ نسخہ قلم بند ہو گیا تو شاہ لطیف نے اس پر نظر ثانی کی اور اس کی تصدیق کی اور فرمایا کہ ان کا کلام کتنا صحیح نقل ہوا ہے۔ اس نسخہ کو "گنج" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ گنج شاہ صاحب کے بڑے خلیفہ تمر فقیر کے سپرد کیا گیا اور اب تک اس کے لواحقین اس کی حفاظت کرتے چلے آرہے ہیں۔ "گنج" میں شاہ صاحب کا کلام بغیر کسی ترتیب یا سلسلے کے درج ہے۔ شاہ لطیف کی وفات کے کچھ عرصہ بعد فقیروں نے ان کے اشعار کو ابیات کے مطابق اور سُروں کی صورت میں ترتیب دیا۔ لیکن ہز ہائینس میر عبدالحسین خان تالپور "لطائف لطیفی" میں لکھتے ہیں کہ شاہ کی زندگی ہی میں ان کے کلام کو ودہند و گوتوں اٹل اور چنچل نے سُر اور داستانوں میں تقسیم کر دیا تھا اور شاہ لطیف نے ہر ایک سُر کا مضمون کے مطابق الگ الگ نام رکھا تھا۔

اس قسم کی داستانیں اب بھی مشرقی شاعروں کے بارے میں کہی جاتی ہیں۔ امیر دولت شاہ سمرقندی نے اپنی کتاب "تذکرۃ الشعرا" میں خود کئی شاعروں کے بارے میں ایسی روایات درج کی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ مظفر ہروی نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اپنا دیوان دریا میں پھینک دیا تھا۔ کیونکہ اس کا یہ خیال تھا کہ اس کے بعد کوئی بھی نہ تو اس کے کلام کی قدر کر سکتا ہے اور نہ ہی مطلب سمجھ سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشہور فارسی شاعر حافظ اپنی غزلیات کاغذ کے پرزوں پر لکھتا تھا اور انھیں ایک مٹکے میں ڈال دیتا تھا جنھیں ان کا نوکر نکال کر باہر پھینک دیتا تھا لیکن اس کا گہرا دوست محمد گل اندام ــــ جس نے اس کا دیوان مرتب کیا تھا ــــ ایسی کوئی

بات نہیں کہتا۔ وہ کہتا ہے کہ میں اکثر و بیشتر حافظ کو سمجھاتا تھا کہ آپ نے ان تابدار گوہروں کو ایک لڑی میں پرو دے تاکہ اس کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں کے لیے یہ ایک زیور کا کام دیں لیکن وہ ہمیشہ یہ عذر پیش کرتا تھا کہ لوگوں میں قدر شناسی کا فقدان ہے۔

یہ بات قابل اعتبار نہیں ہے کہ کوئی شاعر اپنا کلام بلا کسی وجہ وجواز کے ضائع کر دے۔ دیکھئے انسان اپنی اولاد کی پرورش اور پرداخت کی خاطر کتنی تکالیف اٹھاتا ہے۔ وہ یہ سب صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کے بعد بھی اس کے نام لیوا باقی رہیں۔ تو پھر ایک شاعر بھی یہ کیوں چاہے گا کہ وہ اپنی روحانی اولاد یعنی شاعرانہ تخیلات کو جن کی اس نے اپنے خون سے آبیاری کی ہے اپنے ہی ہاتھوں سے ضائع کر دے۔ انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن (MILTON) نے کس بلیغ انداز میں کیا مزے کی بات کہی ہے کہ کوئی بھی ایک عمدہ تصنیف ایک اعلیٰ انسان کے جگر کا خون ہے جسے ہوا دھوتی دے کر ہمیشہ کے لیے سنبھال کر رکھتی ہے اور خود شاعر کو بھی اپنے کلام کی قدر شناسی کا احساس رہتا ہے۔ کئی شاعروں نے اپنے کلام کو بقائے دوام ملنے کی خواہش کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے۔ سچا شاعر حق بات کہتا ہے اور حق نہ کبھی مرتا ہے اور نہ ہی مارا جاتا ہے یعنی حق ہمیشہ غالب ہے یہ کبھی بھی مغلوب ہونے کے لیے نہیں ہے۔ فردوسی اپنے مشہور زمانہ شاہنامہ میں اپنے کلام کے بارے میں کیا خوب کہتا ہے کہ

بناہائے آباد گردد خراب　　　زباراں و ز تابش آفتاب
پے افگندم از نظم کاخ بلند　　　کہ از باد و باراں نیابد گزند

یعنی برسات اور سورج کی تابش کی وجہ سے خستہ مکان بھی ویران ہو جائیں گے لیکن میری نظم کا محل بلند ہے اور اسے نہ تو بارش اور نہ ہی ہوا نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اسی طرح عرب و فارس کے کئی عظیم شعرا جن میں کئی کو ولی بھی لکھا جاتا ہے اپنے کلام کی پائندگی کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً مولانا رومی بھی کہتے ہیں۔

بعد از وفات تربت ما در زمین مجوی
در سینہائے مردم عارف مزار ماست

یعنی میرے مرنے کے بعد میری قبر زمین کے اندر سما جائے گی لیکن میرا مزار عارفوں کے سینے میں رہے گا۔ لیکن دوسرے شعرا کی طرح شاہ لطیف نے اپنے کلام میں اس طرف کوئی واضح اشارہ نہیں کیا ہے البتہ درج ذیل ابیات میں انھوں نے مبہم انداز میں ایسی آرزو ضرور کی ہے

سنڌ سِيں سِگَ ٿِيِي، پر ڪِنديِن پِيَاس
ٿِيرِ برهمڻ؟ ڪَن جِي ٿِيرِ جَاتِيِ ڪَيٽاس
هنڌ نه سنڌ سياس، هن پريين ٿيس ٻڌري

یعنی شاہ صاحب سسی سے فرماتے ہیں کہ "اس بانکے بھالو رے سجن (پنھوں) کے تعلق سے سسی نے دیس بدیس شہرت پائی وگرنہ کسے معلوم تھا کہ وہ برہمن زادی کون تھی اور کس سے منسلک تھی؟ یوں تو سندھ ہی میں اس کا چرچا نہ ہوتا لیکن اس تعلق کی وجہ سے اس نے پورے عالم میں شہرت دوام پائی۔"

اب وقت آیا ہے کہ شاہ کی شہرت، ان کے کلام کے ذریعہ دور دور ہو اور کیا عجب جو بہت جلد ان کے سخن کی خوشبو اہل ولایت کو بھی مسحور کر دے۔ درج بالا خواہش کے دو اسباب ہیں۔ اوّل یہ کہ ایسے شاعر جن کو ہم ولی سمجھتے ہیں اور ان کے بارے میں ان کے مرید اور فقیر یہ گمان رکھتے ہیں کہ شاعری ان کی کرامات اور خرق عادات کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ شاعروں کی ولایت پر زیادہ زور دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے بھی مشہور صوفی شعرا کے بارے میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ ایسے ہر ایک شاعر کے بارے میں کہتا ہے کہ "شاعری دونِ مرتبۂ اوست"، یعنی شاعری ان کے مرتبہ سے کم ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے شعرا کے مریدوں اور معتقدوں کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ کلام بہت ہی کم ہے یا اس میں کچھ ہے۔ اور اسی غرض سے وہ یہ بہانے تراشتے ہیں کہ جو اصل شے ہے وہ گم ہو گئی ہے، باقی نقل موجود ہے۔ ایسی باتیں صرف عقل کے ماروں اور تنگ بندی کے ذریعہ مجمع کرنے والوں کے لیے گھڑی گئی ہیں۔ ہندو پنڈت بھی کہتے ہیں کہ ان کی مشہور رزمیہ مہابھارت جیسی ضخیم کتاب دنیا میں نہ ملے گی۔ لیکن علما کی رائے اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ کتاب دراصل بہت ہی مختصر تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ کئی لوگوں نے اپنا کلام بھی اس میں شامل کر دیا جس کی وجہ سے مہابھارت ایک جنگل بن گئی ہے۔ شاہ جو رسالو کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی سلوک دیکھنے میں آتا ہے۔ کئی کئی سُر اور اشعار رسالو کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں شامل ہیں جن کی تصنیف کا شاہ عبداللطیف بھٹائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کئی فارسی شاعروں مثلاً حافظ، حکیم سنائی، محی الدین، جلال الدین رومی وغیرہ کی غزلیں، قصائد اور مثنویاں بھی شاہ کا کلام سمجھ کر رسالو میں درج کر دی گئی ہیں۔ تقریباً پچاس بیت شاہ عبدالکریم بلڑی والے کے اور چار پانچ بیت قاضی قاضن کے "رسالو" میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے گمنام سندھی سگھڑوں مثلاً دھوبی، کٹی، ملکھیل، ہیبو، خمیسو، کبیر، قطب، لاکھو اور ملکھیر وغیرہ کے غیر موزوں ابیات بھی شاہ کے کلام میں شمار کیے گئے ہیں۔ اسی طرح کئی بیت ایسے ہیں کہ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہ کے ابیات کا جواب ہیں۔ اسی طرح کئی ہندستانی، پنجابی، اور سرائیکی وائی اور کافیاں جو عرصہ دراز سے ناچنے والوں اور مسخروں سے سنتے آئے ہیں، وہ بھی شاہ کی سنجیدہ اور من موہن کافیوں کی بجائے ٹرمپ کے مطبوعہ نسخے کے علاوہ دیگر تمام نسخوں میں موجود ہیں۔

درج ذیل سُر اور داستانیں جو عام طور پر تمام نسخوں میں موجود ہیں لیکن ان کے بارے میں کافی تفحّص اور غور و فکر اور اندرونی اور بیرونی شہادتوں کو روایت و درایت کی کسوٹی پر پرکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام نہیں ہے۔

۱۔ سُر سسئی آبری کی آخری سہ حرفی۔

۲۔ سُر بیراگ ہندی۔ اس سُر میں شاہ عبداللطیف کا برائے نام بھی کوئی بیت نہیں ہے بلکہ کئی مشہور ہندی شاعروں مثلاً گورونانک، کبیر بھگت، دادو، سمن، بھائی پرمانند اور رکالو وغیرہ کے ہندی دوہوں اور گیتوں کا انتخاب دے دیا گیا ہے۔ سُر کے آخر میں مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کے الگ الگ دفتروں سے اولیائے کرام کی تعریف میں کہا گیا مدحیہ کلام بھی درج کر دیا گیا ہے اور اس کی آخری وائی مشہور شاعر حکیم سنائی کی تصنیف کردہ مناجات ہے۔

۳۔ سُر ہیر رانجھا۔ اس سُر کی بولی نہ تو ٹھیٹ پنجابی ہے اور نہ ہی سرائیکی بلکہ سیالکی معلوم ہوتی ہے۔ ہیر رانجھا کا قصہ پورے پنجاب میں اتنا مشہور ہے کہ جتنا عربی میں لیلیٰ و مجنوں اور فارسی میں شیریں فرہاد کا قصہ۔ ہیر جوچک ضلع مظفرگڑھ

کے ایک گاؤں رنگ پور میں رہتی تھی اور رانجھا کا اصل نام دیڈو تھا مگر وہ ذات کا جاٹ تھا۔ ان دونوں عاشقوں کا قصہ کئی پنجابی شاعروں مثلاً دامودر پتواری اور وارث شاہ وغیرہ نے نظم کیا ہے اور رسالو" میں درج شدہ قصہ بھی اسی علاقہ کے کسی شاعر کا کہا ہوا ہے۔

۴۔ سُر بردو سندھی چھوٹکو ۔۔۔ یہ سُر صرف ٹرمپ کے مطبوعہ نسخے میں دیا گیا ہے۔ ابیات کی بناوٹ کے علاوہ اس میں جو تخیل کار فرما ہے۔ وہ ابہام زدہ اور بے سواد ہے کہ اپنا جواب ہی آپ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی سگھڑ کا کہا ہوا ہے۔

۵۔ سُر رام کلی ۔۔۔ ٹرمپ کے مطبوعہ نسخے کے علاوہ دیگر تمام نسخوں میں ہر ایک داستان میں کئی بیت ہیں۔ جو شاہ کے کہے ہوئے نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں بمبئی کے مطبوعہ نسخے نے تو سب کو مات کر دیا ہے۔ دوسری داستان میں سنیاسیوں اور جوگیوں کے بارہ دن کے کریا کرم کا بیان ہے لیکن بمبئی کے مطبوعہ نسخے میں باقی اٹھارہ دن کا بیان بھی ملے گا۔ اور اس طرح ایک ماہ پورا کر دیا گیا ہے۔ یہ زائد ابیات شاہ کے ایک مرید ولی محمد ہالیپوٹہ کے کہے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سُر رام کلی کے آخر کی سہ حرفی بھی شاہ کی کہی ہوئی نہیں ہے۔

۶۔ سُر کاپائتی کی آخری مت ۔۔۔ یہ مت صرف ٹرمپ کے مطبوعہ نسخے میں دی گئی ہے اور فارسی نظم مسمط کے طرز پر کہی گئی ہے۔ یہ بھی شاہ کا کلام نہیں ہے۔

۷۔ سُر مارئی ۔ اس سُر کی دسویں داستان جس کی ہر سطر میں قرآن کریم کی ایک نہ ایک سورۃ کا نام زبردستی درج کیا گیا ہے اسے کسی بھی صورت میں شعر کہنا مناسب نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ داستان ایک ہارون شاہ بنگوری کی فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح گیارہویں داستان میں بھی کوئی شاعرانہ خوبی اور لیاقت نظر نہیں آتی ہے۔ کسی سگھڑ نے شاہ صاحب کے دوسری داستانوں میں شامل الفاظ و اصطلاحات کو جمع کر کے ایک خود ساختہ داستان بنا دیا ہے۔

۸۔ سُر ڈناسری ۔۔۔ اس سُر میں خود شاہ عبداللطیف کی مدح میں بیت کہے گئے ہیں اور اکثر و بیشتر شاہ حبیب اور شیخ عبدالقادر جیلانی" کی مدح کی گئی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ یہ ابیات ان کے فقیروں اور مریدوں نے لکھے ہیں۔

۹۔ سُر ڈول مارئی ۔۔۔ یہ سُر دھٹکی بولی میں ہے اور بھٹ شاہ والے نسخے میں نہیں دیا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سُر شاہ کا کلام نہیں ہے۔

۱۰۔ سُر بسنت و بہار ۔۔۔ یہ سُر بہت ہی چھوٹے ہیں اور ایک داستان میں سمائے ہوئے ہیں اور اس میں زیادہ تر لاکھی کے ابیات درج ہیں جو بھٹ شاہ والے نسخے میں موجود نہیں ہیں۔

ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ وہ پہلا شخص ہے جو شاہ جو رسالو کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا۔ اگرچہ اس شخص کو حکومت برطانیہ نے کافی مالی امداد دی تھی لیکن اس کے باوجود اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے وہ کئی سُر جن میں سُر مارئی بھی شامل ہے، شائع نہ کر سکا۔ ٹرمپ اپنے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اسے دو قدیم نسخے ملے جن کو ایک ہشیار پڑھے لکھے فرد کی مدد سے مدوّن کر کے یہ نسخہ تیار کیا۔ اسے اس نے ۱۸۶۶ء میں جرمنی کے شہر لیپسا سے شائع کرایا۔ آفریں ہے اس کی ہمت و سرجوشی کو۔ وہ خود علم لغت

کا ماہر بھی تھا اور رسالو کے شائع کرانے سے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ علم لغت کے لیے مزید ذوق و شوق پیدا ہو لیکن افسوس کہ قلمی نسخوں کے تقابلی جائزے کا کام کلّی طور پر اپنے ذمّہ نہ لیا اور مددگار نے کام کی قدر کو نہ جانا جس کی وجہ سے ٹرمپ کے رسالو میں کئی خامیاں رہ گئیں۔ مثلاً ایک تو یہ کہ رسم الخط خود ٹرمپ کے قول کے مطابق نہ تو اصل ہے اور نہ موجودہ بلکہ خود اس کا تیار کردہ۔ دوم یہ کہ تلفظ نہ تو ۱۸۶۶ء کا اور نہ ہی اصل قلمی نسخوں کا اختیار کیا گیا ہے۔ سوم یہ کہ نسخوں کی عبارت کئی جگہ مرتب کی سمجھ میں نہ آسکی بلکہ اس کی جگہ کئی خود ساختہ تلفظ دیئے گئے ہیں۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ جو وائی درج کی گئی ہے وہ درحقیقت شاہ کی کہی ہوئی ہے۔ لیکن دوسرے نسخوں اور خود بھٹ شاہ اور بلڑی والے نسخوں میں اس کے بدلے مسخروں کی وائیاں شامل ہیں۔ عرصہ دراز سے ٹرمپ کا مطبوعہ نسخہ نایاب ہے۔ پھر ۱۸۶۷ء میں قاضی ابراہیم کی کوشش سے رسالو کا ایک سنگی مطبوعہ نسخہ بمبئی سے شائع ہوا۔ کئی لوگوں کو یہ وہم ہے کہ یہ مطبوعہ نسخہ اصل "رسالو" کی صحیح نقل ہے لیکن ایسا مطبوعہ ردی نسخہ اب نہیں ملے گا کیونکہ سندھ میں جو لوگ کچھڑی تمام کلام شاہ سے منسوب کر کے گاتے ہیں یا جوابیات مسخرے مجالس میں اور کھیلوں کے وقت کہتے ہیں وہ تمام بلا کسی فرق کے اس میں شامل ہیں اس کے علاوہ اس نسخے کا رسم الخط پرانا ہے جس کی وجہ سے مطالعہ میں کافی دقت ہوتی ہے۔

۱۹۰۰ء میں سندھ کے محکمۂ تعلیم نے بھی شاہ جو رسالو کو موجودہ سندھی رسم الخط میں شائع کرایا۔ اس کے دیباچے میں کہا گیا ہے کہ یہ نسخہ بھٹ شاہ والے نسخہ اور درج بالا دونوں طباعتوں کو سامنے رکھ کر مدون و مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک رسالو کی تدوین و اصلاح کا تعلق ہے تو صرف رسم الخط کے علاوہ اس میں کوئی اصلاح نظر نہیں آتی۔ ایک تو شاہ کے کلام سے الحاقی کلام کو الگ کرنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ دوسرے یہ کہ علم لغت سے ناواقفیت کی وجہ سے شاہ کے دور کا تلفظ بدلا کر اسے حیدرآبادی لباس پہنا دیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ قلمی نسخوں کے کئی صحیح تلفظ کی جگہ قیاسی تلفظ اختیار کیا گیا ہے۔ چوتھے یہ کہ کسی بھی تمیز و تنقید کے بغیر درج بالا مطبوعہ نسخوں سے لیے گئے کئی سُر اور بیت زیادہ دیئے گئے ہیں۔ یہ رسالہ اب تک تین مرتبہ شائع ہو چکا ہے لیکن بات وہیں کی وہیں ہے۔

پھر ۱۹۱۳ء میں مرزا قلیچ بیگ نے اپنا مرتبہ شاہ جو رسالو شائع کیا۔ اس کی تدوین میں انھوں نے کافی محنت کی پہلے کے مطبوعہ نسخوں اور خاص طور پر بمبئی کے مطبوعہ نسخے کے بہت سے ابیات اپنے مرتبہ نسخے میں شامل کیے تاکہ ایک قاری کو الگ الگ طباعت کی ابیات یکجا آسانی سے مل جائیں۔

مرزا قلیچ بیگ نے اپنی کتاب "شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حالات" میں رسالو کے الحاقی سُروں اور ابیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاہ جو رسالو کے صحیح اور مستند نسخے کی اب بھی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اہل قلم کے دل میں یہ خیال آجائے اور وہ ایسی کتاب شائع کر سکے کہ قاری اس کا مطالعہ کر کے خوش ہوں اور اس کے لیے دعائے خیر کریں۔ سگمانے بھی اپنی کتاب "سندھ کے بارے میں کچھ تذکرہ" میں بڑے افسوس کے ساتھ اسی قسم کی شکایت کی ہے اور خود ہز ہائینس میر عبدالحسین خان تالپر نے "لطائف لطیفی" میں لکھا ہے کہ رسالو کے تمام نسخوں میں فقیروں کی تصنیف کردہ ابیات اور سُر داخل کیے گئے ہیں اور اب تک جو بھی مطبوعہ نسخے سامنے آئے ہیں وہ بھی سراسر غلط اور غیر معتبر ہیں۔

اب "رسالو" کے تمام مطبوعہ اور بھٹ شاہ، بلڑی اور میر عبدالحسین خان والے قدیم قلمی نسخوں کا تقابلی جائزہ

لے کر الحاقی ابیات اور سُروں کو کافی غور و فکر اور تنقید کے بعد رد کر کے شاہ جو رسالو کا حتی المقدور صحیح نسخہ تیار کیا گیا ہے[1] الفاظ کے ہجّے موجودہ رسم الخط میں دیئے گئے ہیں لیکن تلفظ اصل لاڑی بولی والا قائم رکھا گیا ہے۔ اور اس کی یہ وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ شاہ کے آباو اجداد مثلاً شاہ عبدالکریم بلڑی والے، علاقہ لاڑ کے قریب رہتے تھے اور خود شاہ عبداللطیف کے بھی لاڑ کے علاقے سے کافی تعلقات تھے جس کی وجہ سے ان کا تلفظ بھی لاڑی ہی تھا۔ دوسرے یہ کہ بھٹ شاہ اور بلڑی کے قدیم نسخوں میں جو تلفظ دیا گیا ہے وہ بھی لاڑی ہے۔ تیسرے یہ کہ لاڑ کے علاقے کے دیہاتی اب تک وہی تلفظ اختیار کیئے ہوئے ہیں۔ چوتھے یہ کہ یہ تلفظ اصل اشتقاق کے مطابق ہے۔ زیادہ فرق صرف ان ہی الفاظ میں ہے جن میں موجودہ سندھی نون غنّہ اور ہ آتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام کافی تحقیق و جستجو کے بعد اب جتنا کچھ سامنے آیا ہے اس سے زیادہ کوئی بھی اعلیٰ درجہ کا شاعر بمشکل ہی کہہ سکتا ہے۔ جس طرح کسی چمن میں گلاب کے پھول کو خودرو پودے اور بیلیں لپٹ جاتی ہیں اور اس طرح اس کے ذاتی حُسن اور جلوؤں کو کم کر دیتی ہیں، اسی طرح بیرونی اور بیگانے شاعروں نے بھی شاہ کے کلام کے حُسن، جلوؤں اور سندرتا کو چھپا کر بے رونق بنا دیا تھا۔ امید ہے کہ اب شاہ صاحب اپنے نورانی جمال و جلال کے ساتھ دوبارہ رونق افروز ہوں گے۔

"زرویت آستیں بزدار و گوہر راتماشا کن"

یعنی میرے اوپر سے پردہ ہٹا کر جواہرات کا جمال دیکھ

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

مصنف: نظام دکنی ——— مرتب: ڈاکٹر جمیل جالبی

قیمت پچیس روپے ——— خصوصی ایڈیشن پچاس روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ بابائے اُردو روڈ، کراچی ۱

---

[1] ڈاکٹر گربخشانی نے شاہ جو رسالو کی پہلی جلد سنہ ۱۹۲۳ء میں شائع کی تھی، مقدمہ اس کے شروع میں شامل ہے۔ دوسری جلد سنہ ۱۹۳۴ء میں، تیسری جلد سنہ ۱۹۳۱ء میں اور چوتھی اور آخری جلد وہ شائع نہ کر سکے۔ گربخشانی ڈی۔ جے کالج کے پرنسپل اور فارسی کے عالم تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۹۴۶ء میں کراچی میں ہوا تھا۔

گلہائے رنگ رنگ

ترکی سے

گیسو

نیاز فتح پوری

یہ تیری بے ترتیب و بے پروا زلف، جو تیرے بلوریں شانہ پر منتشر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کس استغنا کے ساتھ مجھے ان لمحہ ہائے شوخ کی یاد دلا رہی ہے جن کا تعلق صرف ایک عورت ہی کے میناے جسم سے ہے۔

تو ان نغمہ ہائے محبت کو یکجا کرنے کی کوشش نہ کر، کیوں کہ گیسو بکھرنے ہی کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ بگڑنے ہی کے لیے سنورتے ہیں

میرا دل اس "دام گاہ عشق" یعنی تیری زلفِ محبّت پناہ کا دائمی اسیر و نخچیر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور تیری زرّیں زلف کا ہر خم سحر آگیں، جس میں اک "خلقت روشن" پنہاں ہے۔ میرے "عشق روح" میں زنجیر کی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن ایک ایسی زنجیر جو مجھے عالمِ نور میں اِدھر سے اُدھر آزاد لیے پھر رہی ہے۔

اے حسن حزیں، اے تاجدار گیسوئے زرّیں، تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میرے "شبہائے عشق" کے جذبات تیری ہی پُر اہتزاز زلفوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور میری صبح تسلّی انھیں کی راتوں میں پنہاں ہے

جب کبھی وہ میرے چہرہ پر پریشان ہو جاتے ہیں اور میں مسرور ہو کر انھیں چومتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری "بہارِ حیات" کار از انھیں میں آسودہ ہے

جب تیرے پر وفا گیسو شبِ الم میں میرے سر پر بکھر جاتے ہیں، تو میں تیرے پہلو میں لیٹا ہوا اپنے آنسو اُن میں پرو تا رہتا ہوں۔ آہ میں اس گیسوئے "تسلیت کار" اس عطر روح پرور کو کیوں کر بھول سکتا ہوں۔

اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تیری زلف "زرتار" میرا کفن ہو سکتی ہے تو میں اسی وقت مذہب پروانہ قبول کے لیے آمادہ ہو جاؤں۔

یہ تیرے پُر محبت اور دل میں "کیفیت سکران" پیدا کرنے والے بال جس قدر میرے محزوں سر پر پریشان ہوتے ہیں، اُسی قدر میرے نقوش تمنا ابھرتے جاتے ہیں آ اور اپنے گیسو کے معطر، منوّر اور ریشمی رومال سے میرے شامہ کو مست اور میری روح کو لرزاں بنا جا۔ (نگار، ۱۹۲۹ء)

گوشۂ طلبہ

اُردو ادب

اقبال اور عظمت انسانی

پروفیسر رفیع عالم

اچھا ادب انسانی بنیاد پر وجود میں آتا ہے۔ انسان دوستی اچھے ادب کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اساطیری عہد سے لے کر کلاسیکی اور کلاسیکی سے رومانی اور پھر جدید عہد تک انسان ہی کسی نہ کسی حوالے سے ادب کا موضوع رہا ہے۔ داستان میں جن پریوں کا ذکر ہو یا جادو ٹونے کا تمام مہمات میں مرکزی کردار انسان ہی ادا کرتا ہے۔ اردو میں قطب شاہ اور ولی سے لے کر میرؔ، نظیرؔ، غالبؔ اور جدید رنگ کے بانی حالیؔ تک کی تخلیقی کوششیں انسان ہی کے ذکر سے مالا مال ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ہر ادبی تخلیق نے اپنے عہد کی فکری و تہذیبی تحریکوں، رسم و رواج اور سماجی مسائل کے حوالے سے انسان کی داستان چھیڑی ہے۔ کسی نے انسان کی انفرادی حیثیت پر زور دیا ہے تو کسی نے اس کی اجتماعی حیثیت کو اہم ٹھہرایا ہے۔ کسی نے سنگین حالات کے سامنے انسان کو بے دست و پا دیکھ کر اس کی مجبوری و بے بسی کا یہ کہہ کر ماتم کیا ہے کہ :

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

اور کسی نے انسان کے مختلف کرداروں اور مختلف حیثیتوں کا ذکر کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ "سو ہے وہ بھی آدمی"

حالی نے انسان کو جدید فکر کی روشنی میں دیکھا اور اس کی قومی حیثیت پر بھی نظر ڈالی۔ وہ اس کی زبوں حالی و خستگی کا ذکر کر کے خاموش نہیں بیٹھے بلکہ انھوں نے

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا

کی مثال دے کر انسانی بے بسی کو امنگ، حوصلے اور ولولے کی راہ سمجھائی جس نے اقبال کے یہاں پہنچ کر ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اقبال نے قرآن و حدیث یعنی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان کی عظمت کا راگ الاپا اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ حالی کی طرح اقبال کے ہاں بھی نئے عہد کے حوالے سے انسان کا تصور ملتا ہے۔ اقبال انسان کے اندر پوشیدہ امکانات سے بخوبی واقف ہیں اور ان کے امکانات کو بروئے کار لانے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تسخیر کائنات انسان کا مقدر

ہے لیکن اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات کو کام میں لائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے اندر خودی کا جذبہ پیدا کرے۔ خودی اپنے آپ سے اور اپنے اندر پوشیدہ قوتوں اور جوہر سے واقف ہونے کا نام ہے۔ وہ خودی کو اس حد تک آگے لے جانے اور ترقی دینے کے قائل ہیں کہ جہاں خدا خود بندے سے اس کی رضا جاننا چاہتا ہے اپنے پوشیدہ جوہر اور اپنی قوتوں کی آگاہی کے بعد ہی انسان تسخیرِ کائنات کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ وہ انسانی کمزوریوں کو توانائیوں سے بدلنے کے قائل ہیں۔ وہ کنجشکِ فرومایہ کو شاہین سے لڑا دینے، کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ سلطانیٔ جمہور کے زمانے کی آمد کی بشارت دیتے ہیں۔ وہ مہر و ماہ پر کمندیں پھینک کر انھیں اسیر کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ انسان عظیم ہے اور اس کے عروج سے اجرامِ فلکی کانپ رہے ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

انسانی عظمت اور انسانی عروج کا یہ اعترافِ جدید ادب کا بڑا اہم سرمایہ ہے۔ یہ اعتراف انسانی قوتوں پر مکمل اعتماد اور یقین کے بعد ہی ممکن ہے۔ اقبال کے یہاں خودی، عشق، حرکت اور عمل انسانی تکمیل اور اس کی عظمت کے مختلف ذرائع ہیں۔ اقبال کی یہی وہ انسان دوستی ہے جس سے ان کی شاعرانہ عظمت عبارت ہے۔

اقبال نے مجموعی حیثیت سے انسانی زندگی کے مختلف عوامل پر نظر ڈالی ہے۔ تہذیب و تمدن، علم اور سائنس، مشرق و مغرب کے فلسفیانہ رویے، مغرب کی حد سے بڑھی ہوئی ترقی اور اس کے نتیجے میں وہاں کے گوناگوں مسائل، عشق اور عقل کی کشاکش، تغیر، عمل یہ سب ایسے موضوعات ہیں جن پر اقبال نے اپنی فکر کے مختلف مرحلوں میں نہایت واضح انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

وہ مغرب کی علمی و سائنسی ترقی کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن اس ترقی میں اہلِ مغرب اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ اب یہ ترقی ان کے لیے دردِ سر بن گئی ہے اور وہ نئے نئے مسائل سے دوچار ہیں۔ اقبال کی نظر میں اس کی وجہ بے لگام ترقی ہے۔ ترقی بری چیز نہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ اگر ترقی کی حیثیت صرف مادی ہو اور اسے روحانی قوتوں کا سہارا حاصل نہ ہو تو ترقی کے نتائج حوصلہ افزا نہیں ہوتے۔ مغرب آج اسی مسئلے سے دوچار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال علم و عقل پر عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ علم و عقل کی حد تخمین و ظن تک ہے۔ علم ظاہری چیزوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن ان کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ عقل کی رسائی بھی صرف ظاہری چیزوں تک ہے۔ عقل کوئی قدم اٹھانے سے پہلے غور و فکر سے کام لیتی ہے۔ اس کی نظر نشیب و فراز پر رہتی ہے۔ وہ خود سود و زیاں کے مسائل میں الجھ کر رہ جاتی ہے اوروں کے مسائل کیا حل کر سکتی ہے۔ علم و عقل کی نگاہیں پردے کے رنگ و حسن میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ پردے کے پیچھے دیکھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عشق کی ضرورت پڑتی ہے۔ عشق مقصود تک پہنچنے کے لیے کوئی سہارا نہیں ڈھونڈتا۔ اس کے یہاں پس و پیش اور ہچکچاہٹ نہیں۔ وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راہ کے کسی خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتا۔ عشق دور سے نظارے کا قائل نہیں۔ اس کے اندر بے باکی ہے، جرأت ہے، ولولہ اور حوصلہ ہے اس لیے وہ پردے کے حسن میں الجھ کر نہیں رہ جاتا بلکہ پردہ اٹھا کر اصل حسن کا نظارہ کرتا ہے۔ عشق کی یہی وہ جرأت و بے باکی ہے

جو اسے علم و عقل سے ممتاز کرتی ہے اور مقصود کے دربار میں اعلیٰ مقام دلاتی ہے۔ زندگی عشق کے بغیر بے رنگ ہے اس لیے زندگی کو عشق کی ضرورت ہے۔

اقبال کی فکر میں عمل کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ دراصل عمل بھی عشق ہی کا ایک حصہ ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر عشق کے بغیر عمل اچھے نتائج نہیں دے سکتا۔ عمل کو صحیح معنوں میں نتیجہ خیز ہونے کے لیے عشق کی اعانت درکار ہے۔ عشق کی بے باکی، جرأت، پاکیزگی اور بے غرضی جب عمل کے حصے میں آجاتی ہے تو انسان چاند کے سینے پر قدم رکھ دیتا ہے اور ستاروں پر کمندیں پھینک کر انھیں اسیر کرنے لگتا ہے اور یہی انسان کی عظمت کی دلیل ہے۔

خود شناسی، عشق، عمل اور نئی زندگی پر یقین چند ایسی خصوصیات ہیں جو اقبال کی شاعری کو ممتاز حیثیت عطا کرتی ہیں اور ان کی بزرگی اور برتری کا روشن ثبوت پیش کرتی ہیں

انجمن ترقی اردو پاکستان کی ایک نادر پیش کش

اردو۔ انگریزی لغت

مرتبہ

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

اس لغت کی ضرورت ایک مدت سے محسوس کی جارہی تھی اور ایک خاص طبقے کی طرف سے بار بار اس کی اشاعت کا مطالبہ کیا جارہا تھا۔ جس میں اساتذہ اور طلبہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۰۸۰ صفحات کی ضخیم لغت نے اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا جو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے والوں کو پیش آتی ہے۔ لغت میں اردو الفاظ ماخذ اور صحیح تلفظ من رسم الخط میں درج ہیں۔

گوشۂ طلبہ

تاریخ

زبانی و تحریری تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

ابتدائی تاریخی سرمایہ، زبانی روایات پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ لوگ اہم واقعات اور حوادث کو یاد کر لیا کرتے تھے اور انہی واقعات و حوادث سے مدت کا تعین کرتے تھے۔ زبانی روایات، قصوں اور کہانیوں میں خرابی یہ تھی کہ نسل بعد نسل ان میں صداقت کم اور مبالغہ و تخیل آمیزی زیادہ ہوتی چلی جاتی تھی، اور ہر نسل ان میں اپنی خواہشات، جذبات اور امنگوں کو داخل کر کے ان کی حقیقت و ماہیت کو بدل لیتی تھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تین نسلوں کے بعد زبانی روایات میں صداقت بہت کم رہ جاتی ہے اور اضافے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ صرف زبانی روایات سے تاریخ کو مکمل طور پر محفوظ نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ واقعات کو بھلا دیا جاتا ہے اور اکثر واقعات کو آگے پیچھے کر دیا جاتا ہے۔ زبانی روایات میں چونکہ واقعات کو سنہ وار اور تاریخ کے ساتھ نہیں بیان کیا جاتا اس لیے بھی یہ تاریخ کے زمرے میں نہیں آتیں۔ صرف وہ واقعات جو تاریخ اور سنہ کے ساتھ بیان ہوں ایسے واقعات تاریخ کے دائرے میں آتے ہیں۔

تحریری تاریخ کے وجود میں آنے سے قبل ایشیا و یورپ میں یہ رواج تھا کہ حکمران اور امراء کے خاندان بھاٹ اور شاعروں کو ملازم رکھا کرتے تھے تاکہ وہ ان کے خاندان کے کارناموں کو محفوظ رکھیں اور ان کا نسب دیوی دیوتاؤں اور مظاہر فطرت سے ملائیں۔ یہ جنگ اور امن میں اہم واقعات کو شاعرانہ مبالغے کے ساتھ منظوم کرتے تھے اور پھر جشن، تہوار اور خاص خاص موقعوں پر ان کو پڑھتے تھے۔

مسلمانوں میں بھی ابتدائی دور میں تاریخ زبانی روایات پر مبنی تھی۔ بعد میں ان روایات کی تصدیق کر کے انھیں تحریری شکل میں لایا گیا اور یہ اہم اصول اختیار کیا کہ ان شخصیتوں اور راویوں کے بیانات سے تاریخ کو مرتب کیا جائے جو خود تاریخ کا کردار ادا کر رہے ہوں اور جنھوں نے واقعات کا مشاہدہ کیا ہو۔ ابن خلدون کے زمانے سے زبانی روایات سے زیادہ تحریری شہادتوں پر بھروسہ کیا جانے لگا۔

ایشیا و افریقہ کے بہت سے ملکوں میں جہاں تاریخ لکھنے کا رواج نہ تھا وہاں آزادی کے بعد قومیت کے زیر اثر ماضی کو ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس نئی تاریخ کی تدوین میں زبانی روایات سے مدد لی جا رہی ہے۔ زبانی روایات کی مدد سے تاریخ لکھنے کے تین مرحلے ہوتے ہیں: مواد کو جمع کرنے کی تیاری کرنا، مواد جمع کرنا اور پھر اس کی تشریح و تعبیر کرنا۔

زبانی تاریخ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ تحریری تاریخ صرف حکمران طبقے کی تاریخ ہے۔ اس میں عوام کی جدوجہد اور تاریخی عمل میں ان کے کردار کو نمایاں نہیں کیا۔ جب ہمارا ملک نوآبادی میں تبدیل ہوا تو غیر ملکی حکمرانوں کی تعریف و توصیف میں تاریخیں لکھی جانے لگیں اور ان کے خلاف عوامی بغاوتوں اور جدوجہد کو تحریر میں نہیں لایا گیا۔ آزادی کے بعد اس بات کی توقع تھی کہ تاریخ کے دائرے کو وسیع کیا جائے گا اور اس میں عوام کے تاریخی کردار کو بھی شامل کیا جائے گا مگر ہمارے بیشتر مؤرخین نے اس روایتی تاریخی اسلوب کو اپنایا اور تاریخ کو صرف حکمران طبقے تک محدود رکھا۔

عوام کی تاریخی سرگرمیوں کی تفصیل نہ تو قدیم تاریخی ماخذوں میں ملتی ہے اور نہ جدید۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوامی سرگرمیاں یا عوامی ردِعمل یا عوامی بغاوتیں جو انھوں نے حکمران طبقے کے خلاف کی تھیں، بالکل بھلا دی گئی ہیں۔ یہ اگر تاریخ کے صفحات پر نہیں تو عوام کے سینوں میں محفوظ ہیں اور سینہ بہ سینہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تاریخی سرمایہ لوک گیتوں، کہانیوں اور قصے کہانیوں میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اس لیے مورخوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ معمر تاریخ کی تعمیر و تشکیل میں اس مواد سے کام لے۔ اسی طرح ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان ہزارہا مزدوروں اور محنت کشوں کی جدوجہد کو منظرِ عام پر لائے جنھوں نے اپنے حقوق کے لیے اپنی جانیں قربان کیں اور جن کی محنت و مشقت سے ملک نے صنعتی و فنی ترقی کی۔

جدید زمانے میں تحریری تاریخ کے ساتھ ساتھ زبانی تاریخ کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ گئی کہ جن جن ملکوں میں تشدد حکومتیں ہیں اور جہاں مورخ ڈر اور خوف سے عوام کی جدوجہد کو تحریر میں محفوظ نہیں کر سکتے، یہ تاریخ زبانی روایات کے ذریعے عوام کے سینوں میں محفوظ رہتی ہے، پھر یہ آنے والے مورخ کا کام ہے کہ ان زبانی روایات کو تحریری شکل میں لا کر تاریخ کی تشکیل کو مکمل کرے۔

مشاہیر یونان و روما

جلد اوّل

(حکیم پلوتارک یونانی کی کتاب "السیر" کا اردو ترجمہ)

مترجم

مولوی سیّد ہاشمی فرید آبادی

صفحات: ۵۳۰ — قیمت: ۶۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

مبصر کے قلم سے

پیش رفت

نیا اردو افسانہ، کُل ہند سیمینار / ورکشاپ

(زیر اہتمام دہلی اردو اکادمی)

سولہ مارچ سے اواخر ماہ تک دہلی میں چند خصوصی ادبی تقریبات ہوئیں جن میں تو پاکستانی شعرا نے بھی شرکت کی۔ جو شعرائے پاکستان دہلی کلاتھ ملز کے سالانہ مشاعرے (منعقدہ سولہ مارچ) میں شرکت کرنے گئے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ زہرا نگاہ، کشور ناہید، ضیا جالندھری، جمیل الدین عالی، محسن بھوپالی، افتخار عارف، سلیم کوثر، احسن رضوی، ناصر زیدی۔

ناصر زیدی، افتخار عارف اور لندن میں مقیم عاشور کاظمی "شامِ بہار ٹرسٹ"، انبالہ کے سالانہ مشاعرے میں بھی گئے اس میں سفیر پاکستان عزت مآب ڈاکٹر ہمایوں خاں نے صدارت کی۔ اور سفارت پاکستان نئی دہلی کے وزیر اطلاعات مرزا حسن عسکری صاحب بھی شریک ہوئے۔ انبالہ میں تقریباً پندرہ مزید شعرائے پاکستان مدعو تھے۔ مذکورہ بالا شعرا میں سے ناصر زیدی کے علاوہ کسی سبب سے کسی اور کو انبالے کے ویزے نہیں دیئے گئے۔ افتخار عارف اور آشور کاظمی لندن سے ویزے لے کر آئے تھے۔

دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرے میں پاکستانی شعرا نے اتنی بڑی تعداد میں پہلی بار شرکت کی تھی۔ یہ مشاعرہ پرانے مالکان سر شنکر لال شنکر اور مرلی دھر شاد کی یاد میں منعقد ہوتا ہے۔ گورنر دہلی نے صدارت کی۔ اطرافِ ہند کے بہت سے مشاہیر شعرا شرکت کرتے ہیں۔

پاکستانی شعرا کے اعزاز میں مسلسل کئی تقریبات ہوئیں۔ غالب اکادمی، ایوانِ غالب، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ جواہر لال نہرو، انجمن ترقی اردو نے استقبالیئے اور محفلیں منعقد کیں۔ سفیر پاکستان نے عصرانہ دیا۔ کئی مقامی جرائد اور اداروں نے عشائیے دیئے۔ آل انڈیا ریڈیو اور ہندستانی ٹیلی ویژن نے شعرا کے انٹرویو ریکارڈ کیے۔

سترہ سے اکیس تاریخ تک دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام غالب اکادمی میں ایک پانچ روزہ "کُل ہند سیمینار اور ورکشاپ" کی گہما گہمی رہی۔ یہ سیمینار نیا اردو افسانہ کے موضوع پر منعقد ہوا تھا۔ اس کی نشستوں اور اسمائے شرکا کی تفصیل آگے آتی ہے۔ یہ ہندستان میں اردو افسانے پر اس پیمانے کا پہلا اتنا بڑا مذاکرہ تھا۔ اس کی تین نشستوں کی صدارت کا اعزاز منتظمین نے ازرہِ مہمان نوازی تین پاکستانی شعرا کو بھی دیا۔ ضیا جالندھری، جمیل الدین عالی اور کشور ناہید اس سیمینار کے ڈائرکٹر پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے۔

ہندستانی مرکزی حکومت کے سرکاری ادارے "ترقی اردو بورڈ" میں انجمن کے معتمد اعزازی کی حیثیت سے جمیل الدین عالی نے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اور انجمن کی نئی مطبوعات پیش کیں۔ بورڈ نے اپنی مطبوعات پیش کیں۔ وہاں عالی صاحب کو ایک غیر شائع شدہ اردو انسائی کلوپیڈیا کے سینکڑوں زیر تدوین صفحات دکھائے گئے۔ ان کا اندازہ ہے کہ ختم ہوتے ہوتے یہ اردو دیس

یہ ایک بڑا علمی کام قرار پائے گا۔

انجمن ترقی اردو ہند نے خصوصی استقبالیہ دیا۔ جس میں جناب مالک رام موجودہ صدر انجمن اور پنڈت انند نرائن ملاّ سابق صدر انجمن نے شرکت کی۔ ان کی خواہش پر جمیل الدین عالی نے مقتدرہ قومی زبان اور انجمن کی سرگرمیوں، نفاذ اردو کی تیاریوں، اشاعتوں اور اشاعتی منصوبوں کی تفصیلی روداد پیش کی۔ بعد میں اس تقریر کے نکات آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر کیے گئے۔

سمینار

پہلا اجلاس

۱۷ مارچ ۱۹۸۵ء صبح دس بجے

صدارت	: محترمہ قرۃ العین حیدر
مہمان خصوصی	: بیگم صالحہ عابد حسین
خیر مقدمی کلمات	: سید شریف الحسن نقوی (سکریٹری دہلی اردو اکادمی)
استقبالیہ کلمات	: پروفیسر گوپی چند نارنگ (مدیر مذاکرہ)
مقالات	: فضیل جعفری
	شمس الرحمان فاروقی
کلمات تشکر	: انور علی دہلوی
	رکن اردو اکادمی

دوسرا اجلاس

۱۷ مارچ ۱۹۸۵ء ڈھائی بجے سہ پہر

صدارت	: دیویندر ستیارتھی	(دہلی)
افسانہ	: قمر احسن	(دہلی)
تجزیہ	: ڈاکٹر نیر مسعود	(لکھنؤ)
افسانہ	: ساجد رشید	(بمبئی)
تجزیہ	: وارث علوی	(احمد آباد)

تیسرا اجلاس

۱۸ مارچ ۱۹۸۵ء دس بجے صبح

صدارت	: رام لال	(لکھنؤ)

افسانہ : کنور سین (دہلی)

تجزیہ : سید ضمیر حسن (دہلی)

افسانہ : انجم عثمانی (بجے پور)

افسانہ : انجم عثمانی (بجے پور)

تجزیہ : سلیم شہزاد (مالی گاؤں۔ مہاراشٹر)

افسانہ : شفق (سہسرام۔ بہار)

تجزیہ : پروفیسر قمر رئیس (دہلی)

چوتھا اجلاس

۱۸ مارچ ۱۹۸۵ء ڈھائی بجے سہ پہر

صدارت : پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ، سری نگر)

افسانہ : علی باقر U.K.-J (اپنے بھائی کے داماد ہیں)

تجزیہ : پروفیسر انور صدیقی (جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

افسانہ : سلام بن رزاق (بمبئی)

تجزیہ : پروفیسر گوپی چند نارنگ (دہلی)

پانچواں اجلاس

۱۹ مارچ ۱۹۸۵ء دس بجے صبح

صدارت : جوگندر پال (دہلی)

افسانہ : سید محمد اشرف (آگرہ)

تجزیہ : شہریار (علی گڑھ)

افسانہ : شوکت حیات (پٹنہ، بہار)

تجزیہ : ڈاکٹر انیس اشفاق (لکھنؤ یونیورسٹی)

افسانہ : ڈاکٹر صغرا مہدی (لکچرر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)

تجزیہ : ڈاکٹر شارب ردولوی (استاد دہلی یونیورسٹی)

چھٹا اجلاس

۱۹ مارچ ۱۹۸۵ء ڈھائی بجے سہ پہر

صدارت : وارث علوی (احمد آباد)

افسانہ : مظہر الزماں (حیدر آباد)

تجزیہ	: انور عظیم	(تاس۔ دہلی)
افسانہ	: رضوان احمد	(پٹنہ، مدیر عظیم آباد اکسپریس)
تجزیہ	: کمار پاشی	(دہلی)
افسانہ	: عبدالصمد	(بودھ گیا۔ بہار)
تجزیہ	: پروفیسر منظور الامین	(تاس دہلی)

ساتواں اجلاس

۲۰ر مارچ ۱۹۸۵ دس بجے صبح

مہمان خصوصی صدارت	: کلام حیدری	(ایڈیٹر "آہنگ"، گیا)
افسانہ	: علی امام نقوی	(امروہہ)
تجزیہ	: ڈاکٹر صلاح الدین	(دہلی کالج)
افسانہ	: ولی محمد چودھری	(امروہہ)
تجزیہ	: ڈاکٹر کامل قریشی	(کروڑی مل کالج، دہلی)
افسانہ	: مجید انور	(بمبئی)
تجزیہ	: عابد سہیل	(لکھنؤ۔ ایڈیٹر کتاب "قومی آواز")

آٹھواں اجلاس

۲۰ر مارچ ۱۹۸۵ء ڈھائی بجے سہ پہر

مہمان خصوصی صدارت	: ضیا جالندھری	(اسلام آباد)
افسانہ	: طارق چھتاری	(گورکھپور ریڈیو)
تجزیہ	: پروفیسر حامدی کاشمیری	(کشمیر یونیورسٹی سری نگر)
افسانہ	: امور خاں	(بمبئی)
تجزیہ	: محمود ہاشمی	(دہلی)

نواں اجلاس

۲۱ر مارچ ۱۹۸۵ء دس بجے صبح

صدارت	: جمیل الدین عالی	(کراچی)

افسانہ : ابنِ کنول (دہلی)
تجزیہ : دیویندر اِسر (دہلی)
افسانہ : مشتاق مومن (بمبئی)
تجزیہ : پروفیسر مغنی تبسم (جامعہ عثمانیہ)
حیدرآباد دکن

دسواں اجلاس

۲۱ر مارچ ۱۹۸۵ء تین بجے سہ پہر

صدر : کشور ناہید (لاہور)
موضوع : نئی فکشن کے بنیادی مسائل

بہت سے شرکاء

تقریباتِ تشکر و اختتام

اس سیمینار کی تفصیلی کارروائی دہلی میں تحریر کی جارہی ہے۔ جب موصول ہوئی "قومی زبان" میں پیش کر دی جائے گی۔
پاکستانی مبصرین کی رائے میں نئے اردو افسانے پر یہ ایک نہایت اہم، فکر انگیز اور تاریخی مذاکرہ تھا۔

علامہ اقبالؒ کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنفہ: احمد دین۔ مرتبہ: مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی، ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

صفحات: ۵۲۸ ــ قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱

رفتارِ ادب

تاریخ اندلس ــ قبل از اسلام

مولف : ثناء الحق صدیقی

سنہ اشاعت : ۱۹۸۵ء

قیمت : ۱۵ روپے

ناشر : مکتبہ فریدی، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔ کراچی ۱۴

اندلس مرحوم کے اسلامی دور کی اہمیت و عظمت اظہر من الشمس ہے لیکن اس کو صحیح تناظر میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کے جغرافیائی حالات اور قبل از اسلام کے تاریخی واقعات کا ایک اجمالی خاکہ سامنے رکھا جائے۔ بدقسمتی سے تاریخ اندلس پر جتنی کتابیں اس وقت تک لکھی گئی ہیں ان میں ان دونوں باتوں کو یا تو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے یا سرسری طور پر نمٹا دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے قارئین کو ایک گونہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ کتاب ہذا اسی کمی کو دور کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اندلس کی وجہ تسمیہ اور وہاں کے جغرافیائی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اسلامی فتح سے پہلے کے حالات دیے گئے ہیں۔ پہلا باب کسی قدر تفصیلی ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جغرافیائی حالات جدید انداز میں پیش کیے گئے ہیں پھر ان کی تلخیص علامہ مقری کی کتاب "نفح الطیب" سے نقل کر دی گئی ہے۔ دوسرے باب میں مولف نے تاریخ ماقبل اسلام کے ضمن میں مختلف اقوام اور ان کے سلاطین کے بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ عہدِ رسالتؐ سے لے کر عہدِ ولید تک کی ہم عصر شخصیات کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر ہر دور کی سیاسی، معاشی، معاشرتی علمی اور تمدنی ترقی کا بھی اجمالی تذکرہ کر دیا گیا ہے تاکہ اسلامی دور کی ترقیات سے ان کا مقابلہ کیا جا سکے۔ امید ہے کہ "تاریخ اندلس" سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بالخصوص طلبہ اپنے لیے اس کتاب کو مفید پائیں گے۔

ڈاکٹر نثار احمد۔ جامعہ کراچی

تحسین واعتراف

مرتب : مختار یونس طاہر

صفحات : ۱۸۴

قیمت : ۳۰ روپے (مجلد)

ناشر : مکتبہ خیر مقدم۔ سرگودھا

اخگر سرحدی انجمن ترقی اردو سرگودھا کے بانی مبانی اور اردو تحریک کے سرگرم مجاہد ہیں۔ انھوں نے اپنے وجود، اپنے فکر وفن اور عمل سے نہ صرف ایک ادبی فضا پیدا کی بلکہ اردو کی ایک تحریک اور ادب کا ایک مکتبہ فکر پیدا کر دیا۔ نصف صدی کی ادب ولسان کی خدمت کوئی معمولی خدمت نہیں ہو سکتی۔ اخگر صاحب نے تو ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری ہے۔ یہ کتاب ان کی انھیں خدمات کے اعتراف و تذکرہ میں احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر انور سدید، حافظ لدھیانوی، پروفیسر مرزا محمد منوّر، شوکت واسطی، ایوب صابر، سید شوکت محمود، سید عطوف شفیق، میر عبدالصمد خاں، مولانا فضل معبود، خواجہ شمیم بھیروی، محمود اسیر، ہارون الرشید تبسم، کے مضامین، افکار اور افادات کا مجموعہ ہے۔ ادب وتحقیق اور تنقید کے ایسے معتبر اہلِ قلم کی یہ "تحسین واعتراف" اس بات کا ثبوت ہے کہ حضرت اخگر کی ذاتِ گرامی ادب وتحریک اُردو میں ایسی شخصیت نہیں جسے نظر انداز کر دیا جائے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

حیاتِ جاوداں سر آدم جی داؤد

مصنف : عبدالقادر حاجی احمد

مترجم : کھتری عصمت علی پٹیل

صفحات : ۵۶

ناشر : آدم جی فاؤنڈیشن۔ کراچی

سر آدم جی میمن برادری کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ ان کی زندگی کا آغاز پچیس روپے کی ملازمت سے ہوا۔ ان کے والد بھی بار دانہ کے معمولی دلال تھے۔ لیکن سر آدم جی نے اپنی محنت اور لگن سے اتنا کچھ کمایا اور اتنی ترقی کی کہ وہ پاکستان کے صفِ اوّل کے چند سرمایہ داروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی دولت کو اپنی برادری میں تعلیم کی اشاعت کے لیے بے دریغ صرف کیا۔ اپنی برادری کی عظیم الشان خدمت کرنے کے علاوہ انھوں نے اپنے ایثار سے قومی خدمت کے میدان میں بھی حصہ لیا۔

یہ کتاب سر آدم جی کے سوانح حیات، تجارت وصنعت میں ان کی ترقی، تعلیم وصحت اور قومی خدمات کے میدان میں ان کے انھیں کارناموں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

تاریخ اور روایات

مصنف : ڈاکٹر مبارک علی

ناشر : آگہی پبلیکیشنز۔ پوسٹ بکس ۱۰۷۸، لطیف آباد، حیدر آباد

قیمت : دس روپے

ڈاکٹر مبارک علی ہمارے ان معدودے چند مورّخین میں سے ہیں جو ہماری قومی تاریخ کے نشیب و فراز پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اس کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تازہ تصنیف "تاریخ اور روایات" اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس سے قبل تاریخ پر ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں انھوں نے ہماری تاریخ کے مختلف ادوار اور اس کے مسائل سے تفصیلی بحث کی ہے۔ زیرِ بحث کتاب کا موضوع بھی تاریخ کی روشنی میں معاشرتی روایات اور اقدار کا تجزیہ کرنا اور اسے دورِ جدید کے تناظر میں معروضی انداز میں پیش کرنا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل ہیں اس لیے ہو سکتا ہے بعض لوگوں کو ان کے خیالات سے سو فیصد اتفاق نہ ہو لیکن انھوں نے جو خیالات پیش کیے ہیں ان سے اختلاف کرنا اور ان کا مدلّل جواب دینا بھی آسان نہیں ہے۔ ان کا یہی نقطۂ نظر سنجیدہ قاری کو ان کی تصانیف پڑھنے پر مجبور کرتا ہے ورنہ تاریخ کے نام پر آج کل کیا نہیں لکھا جا رہا ہے۔

"تاریخ اور روایات" کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں مصنف نے قدیم و جدید روایات سے بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں انھوں نے تاریخ نویسی اور تاریخ کی تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا نظریے کا احیا ممکن ہے یا تاریخ نویسی کیا ہے یا تاریخ کیسے پڑھانا چاہیے وغیرہ۔ ڈاکٹر مبارک سندھ یونیورسٹی میں تاریخ کے معلّم ہیں اس لیے تاریخ پڑھاتے وقت ان کے سامنے بعض بنیادی مسائل پیدا ہوتے ہیں چنانچہ انھوں نے ان سے تفصیلی بحث کی ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ لکھنا سب سے آسان کام سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تاریخ کو ابھی تک سائنس کا درجہ نہیں دیا ہے۔ اور محض واقعات کو تاریخ وار لکھ دینے کو تاریخ سمجھ لیا ہے۔ ڈاکٹر مبارک ایسا نہیں سمجھتے اسی لئے انھوں نے ہماری تاریخ کا از سرِ نو معروضی انداز میں جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں بعض اہم مباحث چھیڑے ہیں۔ مثلاً یہ کہ تاریخ کو مذہب سے منسلک کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس سے کیا کیا پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں یا یہ کہ نظریے کا احیا ممکن ہے یا نہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو آج کے دور کے اہم ترین سوالات ہیں جن پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

شہزاد منظر

حدیثِ خواب

مصنف : عبدالعزیز خالد

ناشر : مقبول اکیڈمی۔ ۱۹۹ سرکلر روڈ چوک انارکلی۔ لاہور

قیمت : ۴۸ روپے

"حدیثِ خواب" معروف شاعر عبدالعزیز خالد کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ لہجے کی انفرادیت اور تحریر کی گنگا جمنی اب ان کی

پہچان بن گئی ہے۔ ان کے اشعار میں کئی خاندانوں کے الفاظ کی یکجائی اس سلیقے سے ترتیب پاتی ہے کہ نہ الفاظ آپس میں دست و گریباں معلوم ہوتے ہیں یا اجنبی لگتے ہیں اور نہ ہی ان کے اَن مِل بے جوڑ ہونے کا قاری کو احساس ہوتا ہے۔ اشعار میں اس طرح کی خوبی صرف اس بنا پر آئی ہے کہ اس کا شاعر کئی زبانوں میں قدرت کی حد تک دست رس رکھتا ہے۔ اس قدرت کا اندازہ "حدیث خواب" کی پہلی نظم "حکایت نے" سے ہو جاتا ہے۔ جسے خوبان دلآرام کا نگارخانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نگارخانے میں چاہت کے حوالے سے دنیا بھر کے چاہنے اور چاہے جانے والے لوگوں کو اپنے لیجنڈ اور خواص کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان میں دیومالائی کردار ہیں، لوک داستانوں کے افراد ہیں، مختلف ادوار کے حکمراں ہیں اور حافظ شیرازی، قطب قلی شاہ دکنی اور شکسپیئر اور ملٹن جیسے شعرا بھی ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیا بھر کی محبت کرنے والی اہم شخصیتیں یہاں موجود ہیں۔

عبدالعزیز خالد نے اس مجموعے میں مختصر ترین یعنی تین مصرعوں کی نظموں کا بھی تجربہ کیا ہے لیکن ان کا جوہر طویل نظموں ہی میں کھلتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ خالد وسیع کینوس کے شاعر ہیں۔ ان کی فکری اڑان کے لیے تنگنائے "ثلاثی" یا تین مصرعے کافی نہیں۔ کتاب اپنی الگ فضا رکھتی ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(ا-س)

سلہٹ میں اردو

مؤلفہ:

عبدالجلیل بسمل

قیمت : چالیس روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی

گردوپیش

انجمن میں وفود کی آمد

۱۸ر مارچ ۸۵ء کو ڈاکٹر جوہر پراچہ صاحب صدر شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی اور ۱۹ر مارچ ۸۵ء کو پروفیسر مرزا رشید احمد صاحب پرنسپل گورنمنٹ ڈگری سائنس کالج کرک (کوہاٹ ڈویژن) اپنے طلبہ و طالبات کے ہمراہ انجمن میں تشریف لائے۔ ان دونوں وفود نے انجمن کے کتب خانۂ خاص اور کتب خانۂ عام کا معائنہ کیا۔ کچھ قدیم دستاویزات اور مخطوطات بھی دیکھے۔ مہمانوں کو انجمن کی طویل خدمات اور کارکردگی کی تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔ ڈاکٹر جوہر پراچہ صاحب اور پروفیسر رشید احمد صاحب نے انجمن سے اپنی دیرینہ دلچسپی کا اظہار کیا اور اپنے تاثرات مہمانوں کے رجسٹر میں قلم بند کیے۔ دونوں وفود کے مذکورہ سربراہوں نے ماہنامہ "قومی زبان" اور سہ ماہی "اردو" کی سالانہ خریداری قبول فرمائی۔ اپنے تعلیمی اداروں کے لیے انجمن کی کچھ کتابیں بھی خریدیں اور وعدہ فرمایا کہ آئندہ بھی انجمن کی مطبوعات کی خریداری کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ (ادارہ)

ملک بھر میں ایک ہزار لائبریریاں

لٹریری پبلیشرز فورم کے زیر اہتمام پہلا چھٹا پانچ سالہ منصوبہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے تحت ملک بھر میں ایک ہزار لائبریریاں قائم کی جائیں گی۔ اس بات کا اعلان فورم کے چیئرمین پیر انور علی نے کیا ہے۔ ان کے مطابق یہ لائبریریاں دیہی علاقوں میں ترجیحی بنیادوں پر قائم کی جائیں گی تاکہ ملک میں تعلیم کی شرح بڑھانے کے لیے عملی تحریک شروع کی جاسکے۔

روزنامہ جنگ لاہور یکم فروری ۸۵ء

پنجاب پبلک لائبریری کی صد سالہ تقریبات کا جشن

لاہور۔ پاکستان کے سب سے بڑے اور قدیم عوامی کتب خانہ، پنجاب پبلک لائبریری لاہور کا ۲۹ر تا ۳۱ر جنوری ۸۵ء صد سالہ جشن منایا گیا۔ جشن کی تقریبات کے دوران میں سیمینار منعقد ہوئے اور کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔

ماہنامہ کتاب فروری ۸۵ء

"تاریخ تصوّف"

پروفیسر صابر کلوروی نے علامہ اقبال کی ایک گمشدہ غیر مطبوعہ کتاب دریافت کی ہے۔ جس کا نام "تاریخ تصوّف" ہے۔ علامہ کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انھوں نے ۱۹۱۶ء میں لکھنا شروع کی تھی لیکن بہ وجوہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے۔ پروفیسر صابر صاحب نے اپنے حواشی کے ساتھ اسے مدون کیا ہے جسے جسٹس جاوید اقبال صاحب کی خصوصی اجازت کے بعد مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور نے چھاپ دیا ہے۔

اس کتاب سے علامہ کے نظریۂ تصوف کو تاریخی پس منظر میں سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس کتاب کو ۱۹۸۵ کی اہم دیافت کے طور پہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

گورنمنٹ کالج ماتسیرہ

لندن میں فیض احمد فیض یادگاری لیکچر

ممتاز پاکستانی شاعر افتخار عارف نے جو آج کل اردو مرکز لندن میں خدمات انجام دے رہے ہیں کراچی پریس کلب کی جانب سے اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ میں شرکت کی۔ اور لندن میں اردو زبان پر ہونے والی تحقیقی اور ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ اردو مرکز لندن کے زیر اہتمام ہر سال فیض احمد فیض یادگاری لیکچر منعقد کیا جائے گا جس میں برصغیر پاک و ہند کے ممتاز ادیب، نقاد اور دانش ور فیض کے فن شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالیں گے۔ انہوں نے کہا کہ برصغیر کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے کتب خانوں میں جو مخطوطات قبضے میں لیے گئے تھے ان پر ایک پاکستانی دانش ور اردو مرکز لندن کے زیر اہتمام تحقیق میں مصروف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مرکز کی عمر اگرچہ چار سال ہے لیکن اس قلیل عرصے میں اس ادارے نے اردو زبان اس کی تاریخ اور تدریس کے سلسلے میں تحقیقی کام شروع کیا ہے اور برطانیہ میں اردو زبان و ادب کے مسائل کے بارے میں تحقیقی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ افتخار عارف نے بعض غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ اس موقع پر بی بی سی کے جناب رضا علی عابدی، شان الحق حقی اور دیگر ادیبوں اور ادب دوستوں نے شرکت کی۔ قبل ازیں پریس کلب کی ادبی کمیٹی کے سربراہ جناب حسن عابدی اور سیکریٹری پریس کلب مجاہد بریلوی نے ابتدائی کلمات کہے۔

روزنامہ مشرق کراچی

"مہر دونیم" کی تقریب رونمائی

۶ اپریل ہفتے کی شام کو ایک مقامی ہوٹل میں لندن سے آئے ہوئے مہمان پاکستانی شاعر افتخار عارف کے شعری مجموعے "مہر دونیم" کی رونمائی کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جناب طاہر مسعود، جناب آصف فرخی اور محترمہ شاہدہ حسن نے مقالات پیش کئے۔ پروفیسر ممتاز حسین نے مہر دونیم پر شاعر کے حوالے سے بات کی۔ تقریب کی نظامت کے فرائض جمیل اختر خان نے ادا کئے۔ مہمان شاعر سے ان کے اشعار سنے گئے اور بعد ازاں یہ ادبی شام نہایت خوش اسلوبی سے اختتام کو پہنچی۔

مطالعہ اردو کے لیے امداد

حکومت پاکستان نے میکگل یونی ورسٹی (مانٹریال) کو دو لاکھ ۳۴ ہزار ڈالر کی امداد دی ہے۔ تاکہ شعبۂ اسلامیات میں مطالعات اردو کو فروغ دیا جا سکے۔ حکومتِ پاکستان اس منصوبے کی تکمیل کے لیے مزید امداد بھیجے گی۔

روزنامہ پاکستان ٹائمز راولپنڈی، ۷ فروری ۸۵ء

سائنسی کتابوں پر ہر سال دو انعام

وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل نے نیشنل بک کاؤنسل کی ایک کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے بتایا کہ سائنسی مضامین میں پہلی اور دوسری بہترین کتاب لکھنے والے مصنفین کو ہر سال ۱۰ ہزار اور ۲۵ ہزار روپے نقد انعامات دیے جائیں گے۔

روزنامہ جسارت کراچی ۵ فروری ۸۵ء

تحسین و اعتراف کی تقریب رونمائی

۲۷ مارچ۔ یوم پاکستان کے سلسلے میں ایک تقریب مولانا اخگر سرحدی صدر انجمن ترقی اردو سرگودھا کے بارے میں ملک کے ممتاز ادبا شعرا اور مقتدر حضرات کے مقالات، پیغامات، منظومات اور تقاریر سے مرتب کتاب "تحسین و اعتراف" کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ صدارت سرگودھا ڈویژن کے ادب پرور کمشنر مہر جیون خان صاحب نے کی۔ جس میں صدر تقریب کے علاوہ پروفیسر غلام جیلانی اصغر، صاحبزادہ عبدالرسول پرنسپل گورنمنٹ کالج، میر مظاہر حسنین ایڈووکیٹ، ہارون الرشید، پروفیسر محمد اقبال ایم۔اے، فقیر محمد صوفی، نذیر خالد ریزیڈنٹ ڈائریکٹر آرٹ کونسل سرگودھا۔ مفتی محمد طفیل گوندی ایڈووکیٹ، ایم۔ ایم ظفر، چودھری عبدالحمید صدر میونسپل کارپوریشن سرگودھا، میاں محمد انور اور مختار یونس طاہر نے کتاب کی افادیت اور اہمیت، نیز اس ضمن میں مولانا اخگر سرحدی کی شخصیت، فن اور خدمتِ اردو پر انتہائی شاندار تقاریر میں پر خلوص خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور شعرائے کرام ظہیر الدین ظہیر، مختار عارف شبلی پانی پتی، اقبال منظر، عظیم مشہود شاہد وغیرہ نے منظوم اظہار تحسین و اعتراف کیا۔ آخر میں بارہ بجے رات تک مجلسِ مشاعرہ جاری رہی جس میں متعدد مقامی شعرا کرام نے اپنے تازہ ترین کلام سے حاضرین کو نوازا۔

۱۶ مارچ کو انجمن ترقی اردو بھلوال کے زیر اہتمام بھی تحسین و اعتراف کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ جس میں گجرات، لائل پور، سندھ، سرگودھا اور بھلوال کے نامور شعرا نے حضرت مولانا اخگر سرحدی کی عدیم المثال خدمات اردو پر زبردست خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا۔ اور مقتدر حضرات نے تقاریر کیں۔

اختر جبین اختر، معاون ناظم انجمن ترقی اردو سرگودھا

نیشنل بک کونسل آف پاکستان ریجنل آفس کراچی کی جانب سے "یومِ پاکستان"

۲۳ر تا ۲۵ر مارچ ۸۵ء ۔ تھیوسوفیکل ہال میں ایک سہ روزہ تقریب منعقد ہوئی۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کے چیئرمین جناب حکیم محمد سعید نے اس تقریب کا افتتاح فرمایا۔ یہاں تحریک پاکستان، قائداعظم اور آزادی کے دوسرے نامور قائدین سے متعلق کتابوں، تصویروں اور تاریخی دستاویزات کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ نمائش کی خاص بات ایک مطبوعہ کتاب کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تھی جس کا موضوع سیرت ہے اور جسے قائداعظم نے تحریر کیا تھا۔ اس کے علاوہ چوبیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ "کتابچہ پاکستان" بھی نمائش کے لیے رکھا گیا تھا جو علامہ اقبال کے خطبۂ الہ آباد کا اردو ترجمہ ہے۔ جسے سردار شاہ گیلانی نے بمبئی سے (غالباً ۱۹۴۲ء) شائع کرا کے لوگوں میں تقسیم کیا تھا۔ (ادارہ)

رحمٰن بابا

کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا ہے کہ صوفی شاعر رحمٰن بابا نے دنیا کے انسانوں کو اتحاد، یگانگت، بھائی چارے، امن و آشتی کا درس دیا تھا۔ وہ یکم اپریل پیر کی شام کو پاکستان نیشنل سنٹر میں صوفی شاعر رحمٰن بابا کے سلسلے میں ایک سیمینار سے خطاب کر رہے تھے۔ سیمینار سے پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید قاسم جان، اسد خان درّانی، عدالت خان، کریم الرحمٰن، موسیٰ اعوان، فضل محمود خان اور سلیم خان نے خطاب کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کہا کہ رحمٰن بابا کے پیغام کو عام کرنے کے لیے ادبی و ثقافتی تنظیم قائم کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیوں میں رحمٰن بابا اور برصغیر کے دیگر صوفی شاعروں کی زندگی پر تحقیقی کام کرنا چاہیے۔ جناب قاسم جان نے کراچی یونیورسٹی میں پشتو ادب کا شعبہ اور رحمٰن بابا چیئر قائم کرنے کی اپیل کی۔

جنگ ۳ر اپریل ۸۵ء

پیر حسام الدین راشدی کی تیسری برسی

ٹھٹھہ ۔ مکلی کلچر اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام منگل کو معروف ادیب و دانشور پیر حسام الدین راشدی کی تیسری برسی شایانِ شان طریقے سے منائی گئی۔ صبح کے وقت مکلی میں ان کے مزار پر محکمہ آثار قدیمہ، پاکستان چلڈرن ٹھٹھہ شاخ اور مکلی کلچرل سوسائٹی کی جانب سے پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور قرآن خوانی کی گئی۔ شام کو پیر حسام الدین لائبریری مکلی میں مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں مقررین نے پیر صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب میں حسین شاہ راشدی اور قائداعظم اکیڈمی کے ڈائرکٹر شریف المجاہد اور سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کے چیئرمین خان محمد پنہور نے شرکت کی۔ اس موقع پر محکمہ آثار قدیمہ کے مقامی کنوینر شرافت اللہ قریشی نے بتایا کہ مکلی کے آثار قدیمہ میں بہت سی ایسی چیزیں بھی تھیں کہ جن کی نشاندہی اگر پیر حسام الدین نہ کرتے تو کسی کو اس کا پتہ بھی نہ ہوتا۔

جنگ ۔ ۴ر اپریل ۱۹۸۵ء

الجواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

صحت تلفظ کا مسئلہ لسانی، ادبی اور علمی اعتبار سے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ کچھ تو اس لیے کہ غلط تلفظ سے معنوی تغیّر پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ اس لیے کہ بعض الفاظ کی معنویت کا تاریخی پس منظر نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔

ایسے ہی الفاظ ہیں دو قمری مہینوں کے نام ہیں جن کے تلفظ میں عام طور پر غلطیاں واقع ہوتی ہیں اور وہ ہیں جُمادی الاولیٰ اور جُمادی الآخرہ۔ بعض لوگ اسے بہ فتح جیم جَمادی بولتے ہیں جبکہ اس کا صحیح تلفظ بہ ضمّ جیم جُمادی ہے۔ اور اس میں معنویت کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ اسے جمادی الاول کہتے ہیں، حال آنکہ عربی قواعد کے مطابق تانیث کی وجہ سے اس کی صفت اولیٰ اور آخری یا آخرہ اور ثانیہ آنی چاہیے۔

ان تمام معنوی اور تاریخی مضمرات کی طرف مستند عربی لغات سے چند اشارات پیشِ خدمت ہیں۔ یقین ہے کہ یہ صحیح تلفظ میں معاون ثابت ہوں گے۔

حکیم محمد سعید

دو قمری مہینے ایسے ہیں جن کے نام جُمادی الاولیٰ اور جُمادی الآخری یا جُمادی الثانیہ ہیں، وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مسعودی نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں یہ نام رکھے گئے تھے، ان دونوں مہینوں میں پانی سوکھ جایا کرتا تھا۔

المسعودی، مروج الذہب
المجلد الثانی، مطبع السعادہ مصر

(۱) جُمادی لجمود الماء فیہ۔ یعنی پانی سوکھ جانے کی وجہ سے ان مہینوں کے نام جُمادی الاولیٰ اور جُمادی الآخرہ رکھے گئے۔

ابن منظور لسان العرب

(۲) جُمادی جُمّاری کے وزن پر ہے، یہ دو مہینوں کے نام ہیں۔ جُمادی الاولیٰ اور جمادی الآخرہ

منتھی الارب ج ۱ بہ ضمن ج م د

ترجمۂ فارسی قاموس المحیط، ادارۂ اسلامیات انارکلی لاہور

(۳) عربی مہینوں کے دو نام ہیں۔ مونث ہیں۔
اِعراب کے ساتھ یہ نام اس طرح درج ہیں۔ جُمادی (جمع جمادیات بنائی گئی ہے۔)

اقرب الموارد
مطبوعہ بیروت ۱۸۸۹

"پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے" زیرِ تکمیل ہے۔ اب یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ضمیمے میں مطبوعات کی فہرستیں شامل کی جائیں۔
قومی کتاب مرکز کی۔
"PUBLICATIONS OF LEARNED BODIES AND RESEARCH ORGANIS ATION S IN PAKISTAN" میں ۸۴
کتب اور ادارہ تاریخ و ثقافت اسلام آباد کی۔ A HAND BOOK ON RESEARCH ACTIVITIES OF LEARNED BODIES میں ۱۱۲
کتب کا اندراج ہے۔ موخر الذکر کتاب ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی ہے۔
مہربانی فرما کر مجھے تازہ ترین فہرست ترجیحی بنیاد پر ذرا جلدی ارسال کر دیجئے تاکہ میں اپنا کام جلدی مکمل کر سکوں۔

پروفیسر ایوب صابر

قومی زبان جس انداز سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے وہ ادارہ تحریر کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے۔ پرچہ کے معیار کی روز بروز تبدیلی و ترقی سے حلقۂ قارئین کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوگا۔
جنوری کے شمارے میں آپ کے اداریے نے یہ واضح کیا کہ حکومت نے قومی زبان کے نفاذ کے سلسلے میں ایک کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعلان خوش آئند ہے۔ قومی تشخص اجاگر کرنے اور قومی اتحاد کے لئے قومی زبان "اردو" کا نفاذ بے حد ضروری ہے۔
اسی شمارے میں مولانا محمد علی جوہر کا ایک نادر خط شائع ہوا ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس خط کے الفاظ خود بتاتے ہیں کہ یہ مولانا کی یقیناً آخری تحریر ہوگی۔ اس خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا بیماری کے دوران بھی کیا کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔ اور آخری وقت تک مسلمانوں کے حقوق کے لیے برسرِ پیکار رہے۔ اس کے بعد محترم ابوسلمان شاہجہاں پوری کے مضمون "مولانا محمد علی جوہر بہ حیثیت ماہر اقبالیات" کی تعریف نہ کرنا مضمون نگار کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ حکیم محمد سعید صاحب کا مضمون "مقاصدِ تعلیم قرآن و سنت کی روشنی میں" اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے ساتھ ہی گوشۂ طلبہ میں ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا مضمون "تاریخ میں فرد کا کردار" طلبہ کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوگا اور طلبہ اس سے استفادہ کریں گے۔
قومی زبان کے دوسرے قارئین کے ساتھ طلبہ خاص طور پر ڈاکٹر حنیف فوق کے "لوحِ محفوظ" سحر انصاری کے "اکبر اور سرسید" ایک نیا تناظر" نثار احمد قریشی کے "اردو میں نثری تراجم کی روایات کا مختصر جائزہ" پروفیسر یونس شرر کے "غیر افسانوی ادب۔ ہیئت اور انداز تحریر" سے بھی مستفید ہو سکیں گے۔ گوشۂ طلبہ میں انداز سے نصاب سے متعلق مختلف عنوانات میں مضامین شائع کر رہا ہے وہ قابلِ تحسین ہیں۔ افسر صدیقی کی نظم اور اداؔ جعفری کے مضمون کے ساتھ گلہائے رنگ رنگ کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔

شہناز افتخار

حرفِ تازہ

کتابیں

روشنی = مصنف : شاہ بلیغ الدین
صفحات : ۵۲۸ قیمت : ۵۰ روپے غیر مجلد۔ مجلد ۶۵ روپے
پتہ : علمی کتاب گھر۔ اردو بازار۔ کراچی (پاکستان)

حمد و نعت = مصنف : ابوالامتیاز۔ ع۔ س۔ مسلم
صفحات : ۲۶۳ قیمت : ۶۰ روپے
پتہ : ۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی لاہور (پاکستان)

بارشِ سنگ = مصنف : جیلانی بانو
صفحات : ۲۴۹ قیمت : ۴۵ روپے
پتہ : مکتبہ دانیال۔ ۲ وکٹوریہ چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی (پاکستان)

آنکھیں = مصنف : سارا شگفتہ
صفحات : ۱۹۲ قیمت : ۴۰ روپے
پتہ : سارا اکادمی ۱۲۰۔ بی بلاک نمبر ۱۱، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی (پاکستان)

طلوعِ اشک = مصنف : احمد رفاعی
صفحات : ۱۲۸ قیمت : ۲۵ روپے
پتہ : مکتبہ شہریار۔ سی ۱۸، یونٹ نمبر ۶ لطیف آباد حیدرآباد (پاکستان)

مولانا ظفر علی خاں = مصنف : ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی
صفحات : ۲۵۶ قیمت : ۴۵ روپے
پتہ : مکتبہ اسلوب، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹ ناظم آباد کراچی ۱۸ (پاکستان)

ایک خواب اور = مصنف : سردار جعفری
صفحات : ۲۰۴ قیمت : ۲۴ روپے
پتہ : مکتبہ دانیال۔ ۲ وکٹوریہ چیمبرز، عبداللہ ہارون روڈ کراچی (پاکستان)

ناشریک = مصنف: طفیل دارا

صفحات : ۱۲۸ ۔ قیمت: ۱۸ روپے

پتہ : آئینۂ ادب ۔ چوک انار کلی لاہور (پاکستان)

عرفانیات = مصنف: عارف سیمابی

صفحات : ۱۶۰ ۔ قیمت: ۳۰ روپے

پتہ : سیماب اکادمی پوسٹ بکس نمبر ۲۳۶۷، ناظم آباد کراچی ۱۸ (پاکستان)

پہلی بارش = مصنف: ناصر کاظمی

صفحات : ۸۴ ۔ قیمت: ۲۵ روپے

پتہ : مکتبۂ خیال، حکیم اسٹریٹ اسلام پورہ لاہور (پاکستان)

سلگتے خیموں کا شہر = مصنف: فخر الدین عارفی

صفحات : ۱۱۲ ۔ قیمت: ۱۵ روپے

پتہ : مکتبہ "مریخ"، محمد پور، شاہ گنج پٹنہ ۶.... ۸ (بھارت)

منزل سعادت = مصنف: حافظ لدھیانوی

صفحات : ۲۷۲ ۔ ہدیہ فی سبیل اللہ دعائے خیر

پتہ : محکمہ تعلقاتِ عامہ ۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ ۔ کراچی (پاکستان)

ارمغان = مصنف: حافظ لدھیانوی

صفحات : ۴۴۰ ۔ ہدیہ فی سبیل اللہ دعائے خیر

پتہ : محکمہ تعلقاتِ عامہ ۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کراچی (پاکستان)

جریدے

ماہنامہ کارواں = مدیر: سید مجاہد علی

صفحات : ۴۲ ۔ قیمت: ۲ ڈالر

ملنے کا پتہ : پوسٹ بکس ۱۱۶، سنٹرم ۔ ۱۰۲، اوسلو ۔ ناروے۔

KARAWANE

POST BOOKS 166, SENTRUM - 0102 OSLO 1 TIF (02) 30 5892

NORWAY

ماہنامہ جستجو = مدیر: عنایت حسین عیدن

صفحات : ۹۷ ۔ قیمت: درج نہیں

پتہ : دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ ۔ پورٹ لوئس، موریشس

ماہنامہ تحریریں = مدیرہ: زاہدہ صدیقی
صفحات ۱۲۶ - قیمت: ۱۰ روپے
پتہ: چوک اردو بازار لاہور (پاکستان)

ماہنامہ آہنگ = مدیر: کلام حیدری
صفحات: ۵۶ - قیمت: ۳ روپے
پتہ: رینہ ہاؤس - جگ جیون روڈ، گیا (بھارت)

ماہنامہ اخبار اردو = مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی
صفحات: ۲۴ - قیمت: ۱ روپیہ
پتہ: مقتدرہ قومی زبان مکان نمبر ۸ - ۱۰ گلی نمبر ۳۲ سیکٹر الیف ۸/۱ اسلام آباد (پاکستان)

ماہنامہ سب رس = مدیر: پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد
صفحات: ۵۶ - قیمت: ۴ روپے
پتہ: ایوانِ اردو - ڈی/۱۴۳ بلاک بی تیموریہ (نارتھ ناظم آباد) کراچی ۳۳ (پاکستان)

ماہِ نو = مدیران: فضل قدیر، قائم نقوی
صفحات: ۶۰ - قیمت: ۲ روپے
پتہ: ۳۲ - اے، حبیب اللہ روڈ - لاہور (پاکستان)

ماہنامہ اظہار = مرتب: کریم بخش خالد
صفحات: ۷۲ - قیمت: درج نہیں
پتہ: شعبۂ مطبوعات، محکمہ تعلقات عامہ حکومتِ سندھ، سندھ اسٹریچن روڈ کراچی ۱ (پاکستان)

ماہنامہ الفاظ = مدیر: جمیل اختر
صفحات: ۸۲ - قیمت: ۵ روپے
پتہ: پوسٹ بکس ۳۲۲۴ کراچی ۲۸ (پاکستان)

ماہنامہ افکار = مدیر: صہبا لکھنوی
صفحات: ۸۴ - قیمت: ۶ روپے
پتہ: رالسن روڈ - کراچی (پاکستان)

ماہنامہ صحیفہ = مجلسِ ادارت: احمد ندیم قاسمی، یونس جاوید
صفحات: ۸۸ - قیمت: ۸ روپے
پتہ: مجلسِ ترقی ادب - ۲ کلب روڈ لاہور (پاکستان)

نئے خزانے

ڈاکٹر ابوسلمان شاھجہاں پوری

خاطر غزنوی	سعید احمد اختر اپنی شاعری کے آئینے میں	نیرنگ خیال	راولپنڈی	اکتوبر ۸۴ء	ص ۱۷
خطیب دردادی	صابر مٹھیالوی	سماج	حضرو	جنوری ۸۵ء	ص ۲۳
خلیل اللہ خاں، ڈاکٹر	ریاض کی خمریہ شاعری	اردو	کراچی	جولائی ۸۴ء	ص ۲۳
خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام	شورش کاشمیری	چٹان	لاہور	۱۹ نومبر 〃	ص ۱۹
دبیر	یاس عظیم آبادی	〃	〃	۱۵ دسمبر 〃	ص ۹
راجی، سید عبدالمجید	جعفر بلوچ کا رنگ سخن	شام و سحر	〃	دسمبر 〃	ص ۵
راشد علی زئی	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	سماج	حضرو	جنوری ۸۵ء	ص ۳۳
رام لعل نابھوی	منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی	ہماری زبان	دہلی	۲۲ 〃 〃	ص ۸
رضا، محمد عارف	حافظ لدھیانوی کے فکر و فن پر ایک نظر	اظہار	کراچی	ستمبر	۸۴ء ص ۲۷
ریاض احمد قریشی، حکیم	شفاء الملک حکیم محمد حسن قریشی	رہنمائے صحت	فیصل آباد	دسمبر 〃	ص ۸
ریاض الدین	مولانا سعید احمد ماہروی	انجمن	کراچی	ستمبر 〃	ص ۲۲
سحر انصاری	اکبر اور سرسید — ایک نیا تناظر	قومی زبان	〃	جنوری	۸۵ء ص ۲۹
سردار احمد خان، ڈاکٹر	مولوی اکرام اللہ خان ندوی	العلم	〃	جولائی	۸۴ء ص ۵۶
سعید خلیل، پروفیسر	مولانا عبدالقادر مرحوم	ندائے افغان	ملتان	یکم نومبر 〃	ص ۴
سلطان رفیع	ڈاکٹر منظور احمد سے انٹرویو	سوداگر	کراچی	نومبر 〃	ص ۹
〃 〃	حاجی محمد عتیق مرحوم پریس والے	〃	〃	دسمبر 〃	ص ۲۲
شارق، شفیق الدین	شناسائی اور جاذب قریشی	سب رس	〃	دسمبر 〃	ص ۴۹
شاہد، خواجہ حمید الدین	محمد قلی قطب شاہ اور اس کی شاعری	〃	〃	جنوری	۸۵ء ص ۹
شفیق، شفیق احمد	غلام عباس — ایک مطالعہ	قومی زبان	〃	نومبر	۸۴ء ص ۳۷
شہاب دہلوی	طوطی ہند امیر خسرو	الہام	بہاول پور	۲۸ 〃	〃 ص ۵
صفدر میر محمد	فتح محمد ملک — ایک نظریاتی نقاد	فنون	لاہور	ستمبر	〃 ص ۹۵

ظ۔ انصاری	حامد سعید خان آف بھوپال	ہماری زبان	دہلی	۲۲ جنوری ۸۵ء	ص ۶
عامر، ڈاکٹر محمد یعقوب	ناسخ و آتش (تقابلی مطالعہ)	نگار پاکستان	کراچی	اکتوبر ۸۴ء	ص ۱۸
عبدالغنی فاروق	لالہ صحرائی سے ایک ملاقات	تکبیر	〃	۱۸ جنوری ۸۵ء	ص ۲۴
〃 〃 〃	〃 〃 〃	〃	〃	۲۵ 〃 〃	ص ۷
عبداللہ، ڈاکٹر سید	خواجہ عبدالوحید	اظہار	〃	ستمبر ۸۴ء	ص ۱۹
علم دار حسین بخاری	میرجی کی باتیں	ماہِ نو	لاہور	جنوری ۸۵ء	ص ۱۸
کاظم، پروفیسر محمد انور	شمس العلماء نواب امداد امام اثر	نگار پاکستان	کراچی	نومبر ۸۴ء	ص ۳۵
کلیم الرحمن، ڈاکٹر	کلیم الدین احمد نقاد کی حیثیت سے	قومی زبان	〃	دسمبر 〃	ص ۱۷
مسعود ہاشمی، سید	اردو کا شاعرِ فطرت۔ فاخر بدایونی	اردو	لاہور	جنوری ۸۵ء	ص ۲۱
محی الدین بدایونی	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	قومی زبان	کراچی	نومبر ۸۴ء	ص ۳۱
مسعود ہاشمی، سید	مجید امجد اور نئی حسیت	سب رس	〃	جنوری ۸۵ء	ص ۲۹
منظر امکانی	خود دشمن آدمی (ایوب گونڈوی)	سماج	حضرو	〃 〃	ص ۱۲
منظور حسین، خواجہ	فانی۔ ایک معنوی ترتیب	فنون	لاہور	ستمبر ۸۴ء	ص ۶۴
نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند	نئی غزل کا جواں مرگ شاعر باقی	نگار پاکستان	کراچی	دسمبر 〃	ص ۷
وقار راشدی، ڈاکٹر	حمید عظیم آبادی	فاران	〃	نومبر 〃	ص ۵۵
یوسف رجا چشتی	وقار اور پاکیزگی کا شاعر۔ پیر اکرم	نیرنگ خیال	راولپنڈی	اکتوبر 〃	ص ۲۷
——	حکیم علی گیلانی پہلا ہندوستانی شارح قانون	رہنمائے صحت	فیصل آباد	دسمبر 〃	ص ۲۱
افضل اقبال	راجہ صاحب آف محمود آباد	لاہور	لاہور	۲۹ 〃 〃	ص ۱۵

تاریخی و سیاسی شخصیات

ادیب، حبیب اللہ	نواب وقار الملک	نیرنگ خیال	راولپنڈی	اکتوبر 〃	ص ۳۵
پریشان خٹک، پروفیسر	مولانا محمد علی جوہر	ندائے افغان	ملتان	یکم جنوری ۸۵ء	ص ۳
خالد کریم بخش	قائد ملت لیاقت علی خاں	اظہار	کراچی	اکتوبر ۸۴ء	ص ۱۸
جمال سید میاں	قائد کشمیر چودھری غلام عباس	کیئر	راولپنڈی	۲۹ جنوری ۸۵ء	ص ۸
صفدر محمود، ڈاکٹر	لیاقت علی خان	تکبیر	کراچی	۲۰ نومبر ۸۴ء	ص ۳۰
علی محمد راشدی، ڈاکٹر	بیگم صدیق علی خاں	اظہار	〃	اکتوبر 〃	ص ۳۰
محمد بن علی اباریاب	وفات بہادر یار جنگ چند تاثرات	فاران	〃	〃 〃	ص ۲۷
مفتاح الرحیم	میرے والد صاحب (مولانا محمد عبدالرحیم)	تکبیر	〃	۸ فروری ۸۵ء	ص ۴۴

مصطفیٰ علی بریلوی، سید	سر علی محمد خان راجہ آف محمود آباد	العلم	جولائی	۸۴ء ص ۱۵
نسیم، حکیم عنایت اللہ	غازی علم الدین شہید	چٹان لاہور	۳۱ دسمبر	〃 ص ۲۷

دینی و مذہبی شخصیات

ابوالبقا ندوی، مولانا شاہ	مولانا سید سلیمان ندوی اور معارف کے شذرات	تعمیرِ حیات لکھنؤ	۱۰ جنوری	۸۵ء ص ۸
ابوعلی	مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی	الاعتصام لاہور	یکم فروری	〃 ص ۱۷
〃 〃	〃 〃	〃	۸ 〃	〃 ص ۱۳
اسد ملتانی	خواجہ غلام فرید	الشمس ملتان	یکم جنوری	۸۵ء ص ۲
اشفاق احمد، مولوی محمد	علامہ شبیر احمد عثمانی	فاران کراچی	دسمبر	۸۴ء ص ۷۵
اعجاز احمد خاں	مولانا انور شاہ کشمیری	البلاغ 〃	نومبر	〃 ص ۵۷
〃 〃	مفتی محمد حسن امرتسری	〃 〃	دسمبر	〃 ص ۵۸
〃 〃	مولانا شاہ عبدالقادر	〃 〃	جنوری	۸۵ء ص ۱۱
بدرالدین بھٹی	ابوحیان توحیدی۔ حیات اور تصنیفات	برہان دہلی	〃	〃 ص ۳۳
برہان الدین سنبھلی، مولانا	شاہ ولی اللہ کی قرآنی تعلیم و تفہیم	الحق اکوڑہ خٹک	اکتوبر	۸۴ء ص ۱۵
〃 〃	شاہ ولی اللہ کا قرآن مجید کی تعلیم میں حصہ	〃 〃	نومبر	〃 ص ۲۳
بہادر حسین ڈار	علامہ شیخ عبدالعلی ہروی	رضاکار لاہور	۱۸ دسمبر	〃 ص ۲
تقی انور علوی	خواجہ عبیداللہ احرار نقشبندی	برہان دہلی	دسمبر	〃 ص ۹
〃 〃	〃 〃	〃 〃	جنوری	۸۵ء ص ۱۷
حمید یزدانی، ڈاکٹر خواجہ	مسلم بنگال کے بزرگ صوفی شیخ علاؤ الدین علاء الحق	سب رس کراچی	دسمبر	۸۴ء ص ۴۳
خالد کریم بخش	مولانا عبیداللہ سندھی رح	لاہور لاہور	۳ نومبر	〃 ص ۵
شریا ڈار، ڈاکٹر	علامہ فضل حق، خیرآبادی	فکر و نظر اسلام آباد	جولائی	〃 ص ۵۱
عبدالرشید عراقی	امام بغوی رح	ترجمان القرآن لاہور	دسمبر	〃 ص ۳۳
شریا ڈار، ڈاکٹر	مولانا اسماعیل شہید اور مولانا فضل حق خیرآبادی	الاعتصام 〃	۳۰ نومبر	〃 ص ۶
راجہ محمد	مفتی اعظم مولانا اکبر عالم کشمیری	انصاف 〃	۶ 〃	〃 ص ۶
رضاالمصطفیٰ چشتی، محمد	مولانا شاہ احمد رضا خاں	الہام[1] بہاول پور	۱۴ 〃	〃 ص ۵

[1] اس شمارے میں مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت، سیرت و خدمات پر اور بھی کئی مضامین نظم و نثر شامل ہیں۔

سعید احمد مارہروی	بوستان اخبار	انجمن	کراچی	ستمبر	″	ص ۱۷
سعید احمد اکبر آبادی، مولانا	مفتی صاحب (عتیق الرحمٰن کی کہانی میری زبانی)	برہان	دہلی	نومبر	″	ص ۷
شاہدہ رشید شیروانی	دقیقی طوسی	″	″	جنوری	۸۵ء	ص ۵۵
عبدالحکیم، مفتی	امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے علوم حدیث پر ایک نظر	البلاغ	کراچی	فروری	″	ص ۳۷
عبدالرحمن خاں، منشی	علامہ شبیر احمد عثمانی	الجیر	ملتان	″	″	ص ۳۳
عبدالرسول، قاضی	مولانا احمد رضا خان رح	فیض الاسلام	راولپنڈی	جنوری	۸۵ء	ص ۹۱
عبدالرشید عراقی	مولانا عبدالاحد خان پوری رح	الاسلام	لاہور	۲ر نومبر	۸۴ء	ص ۴
″ ″ ″	مولانا سید امیر علی رح	″	″	۹ر ″	″	ص ۱۲
″ ″ ″	امام بقی بن مخلد قرطبی	″	″	۱۱ جنوری	۸۵ء	ص ۱۱
″ ″ ″	برصغیر میں علمائے اہلِ حدیث کی تدریسی و تحریری خدمات	صحیفہ اہلِ حدیث	کراچی	۱۰ر دسمبر	۸۴ء	ص ۸
″ ″ ″	″ ″ ″ (۲)	″	″	جنوری	۸۵ء	ص ۶
″ ″ ″	″ ″ ″	″	″	۹ر ″	″	ص ۱۲
″ ″ ″	″ ″ ″	″	″	۲۳ر ″	″	ص ۱۵
″ ″ ″	مولانا حافظ عبدالوہاب محدث دہلوی	″	″	نومبر (اول)	″	ص ۷
″ ″ ″	مولانا قاضی عطاء محمد پشاوری	″	″	دسمبر (اول)	″	ص ۱۰
عبدالعزیز بلوچ	مولانا تاج محمود	چٹان	لاہور	۲۱ر جنوری	۸۴ء	ص ۲۷
عبدالقدوس ہاشمی	علامہ سید سلیمان ندوی	فاران	کراچی	نومبر	″	ص ۴۶
عبداللہ، ڈاکٹر سید	مولانا فضل حق خیرآبادی	شام اکبر	لاہور	″	″	ص ۱۱
عبدالرشید عراقی	امام غزنوی؟	ترجمان الحدیث	″	اکتوبر	″	ص ۱۹
عبیداللہ کوثی ندوی	صاحب ہدایہ برہان الدین مرغینانی	الحق	اکوڑہ خٹک	نومبر	″	ص ۴۱
″ ″ ″	″ ″ ″	″	″	دسمبر	″	ص ۳۶
عزیز، غازی	امام غزالی شریعت کی عدالت میں	محدث	لاہور	نومبر	″	ص ۲۲
″ ″ ″	″ ″ ″	″	″	دسمبر	″	ص ۳۳
عزیز، محمد امین	مولانا محمد اسمٰعیل العمری	الاسلام	″	۲ر نومبر	″	ص ۱۳
عنایت اللہ پشاوری، مولانا	مولانا لطف اللہ پشاوری	بنیات	کراچی	دسمبر	″	ص ۶۲
عنایت اللہ وارثی	وصیت نامہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	محدث	لاہور	جنوری	۸۵ء	ص ۴۹
قدوسی، عبدالخالق	مولانا سید نذیر حسین دہلوی	الاسلام	″	۱۸ر ″	″	ص ۷

〃	〃 〃 〃	〃	〃	۲۵ 〃	〃	ص ۵
〃	〃 〃 〃	〃	〃	یکم فروری	〃	ص ۷
〃	〃 〃 〃	〃	〃	۸ 〃	〃	ص ۵
〃	〃	〃	〃	۱۵ 〃	〃	ص ۵
کوکب، میاں غلام رسول	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ	الجامعہ	جھنگ	جنوری	〃	ص ۲۲
محمد حسن علی رضوی	اعلیٰ حضرت امام احمد رضا	الہام	بہاولپور	۲۸ جنوری	۸۵ء	ص ۲
محمد حنیف یزدانی	مولانا سید محمد داؤد غزنوی	الاسلام	لاہور	۱۴ دسمبر	۸۴ء	ص ۱۵
محمد صدیق ہزاروی	مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خان	الہام	بہاولپور	۷ جنوری	۸۵ء	ص ۵
محمد یامین محمدی، پروفیسر	مولانا عبداللہ نوڈیروی	الاسلام	لاہور	۱۵ فروری	〃	ص ۱۲
مسعود انور علوی کاکوروی	حضرت شاہ اہل اللہ پھلتی	برہان	دہلی	نومبر	۸۴ء	ص ۴۵
ہدایت اللہ، مولانا	مولانا لطف اللہ پشاوری	بنیات	کراچی	〃	〃	ص ۴۶
〃	〃 〃 〃	〃	〃	جنوری	۸۵ء	ص ۵۷

صحابہ کرام

انتظام محمد خان، کنور	حضرت یزیدؓ بن ابوسفیانؓ	الشمس	ملتان	۵ فروری	۸۵ء	ص ۳
خالد محمود، مولانا	فاروق اعظم کے فقہی اجتہادات	〃	〃	۲۴ جنوری	〃	ص ۲
〃	〃 〃 〃	〃	〃	۵ فروری	〃	ص ۲
سعیدالرحمٰن علوی مولانا	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ	حکمت قرآن	لاہور	فروری	〃	ص ۴۴
محمد طالب ہاشمی	صحابہ رسول اللہ	فاران	کراچی	اکتوبر	۸۴ء	ص ۱۳
〃		〃	〃	دسمبر	〃	ص ۵۳
محمد اطہر مبارک پوری، مولانا	حضرت سلمان فارسیؓ کی عمر	صدق جدید	لکھنؤ	۲۳ نومبر	〃	ص ۷
مہر اللہ یار خاں	حضرت عائشہ صدیقہؓ	الجامعہ	جھنگ	دسمبر	〃	ص ۷۹
〃	حضرت فاطمۃ الزہرا	〃	〃	جنوری	۸۵ء	ص ۵۶

صحافت

الطاف رسول	اردو کے چند قدیم اخبار و رسائل	اردو نامہ	لاہور	نومبر	۸۴ء	ص ۱۳

شانتی رنجن بھٹاچاریہ	بنگال میں اردو صحافت	اردو	کراچی	جولائی	؍؍	ص ۵
نسیم، حکیم عنایت اللہ	ظفر علی خاں کی صحافت	چٹان	لاہور	۳۱ دسمبر	؍؍	ص ۲۹

علوم وفنون

اطہر، حکیم محمد رمضان	معیاری دواسازی اور اس کے بنیادی تقاضے	رہنمائے صحت	فیصل آباد	دسمبر	۸۴ء	ص ۳۷
عابد، حکیم محمد عبداللہ	طب اسلامی کی افادیت	خبرنامہ طب	لاہور	اکتوبر	؍؍	ص ۵
—	فنڈامینٹل ازم	طلوع اسلام	لاہور	نومبر	؍؍	ص ۱۰
—	مولانا رومی اور طب مشرق	شمع صحت	حیدرآباد	ستمبر	؍؍	ص ۳

ابوسلمان شاہجہاں پوری	نئے خزانے (مئی تا جولائی ۸۴ء کے مضامین کا اشاریہ)	قومی زبان	کراچی	نومبر	۸۴ء	ص ۸۷
؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	دسمبر	؍؍	ص ۸۷
؍؍	؍؍ (اگست تا اکتوبر ۸۴ء ؍؍ ؍؍)	؍؍	؍؍	جنوری	؍؍	ص ۹۳
الطاف الرحمٰن بنوی	کتابیات ـ سیرۃ الخلیل (باب دوم)	حکمت قرآن	لاہور	دسمبر	؍؍	ص ۵۲
حامد، بشیر حسین	اردو نثر میں ذخیرۂ سیرت	فاران	کراچی	؍؍	؍؍	ص ۳۳
حلیم چشتی، محمد	کتاب سازی و کتب خانہ سازی	ترجمان القرآن	لاہور	جنوری	۸۵ء	ص ۲۶
حمید اللہ بشینوی	کتب خانہ	ماہِ نو	؍؍	؍؍	؍؍	ص ۳

مذہبیات

تفسیر و قرآنیات

اسرار احمد، ڈاکٹر	الہدیٰ (بیسویں نشست)	میثاق	لاہور	دسمبر	۸۴ء	ص ۳۳
؍؍	؍؍ (اکیسویں نشست)	؍؍	؍؍	فروری	۸۵ء	ص ۶۳
؍؍	آلمٓ (سورہ السجدہ)	حکمت قرآن	؍؍	دسمبر	۸۴ء	ص ۲۹
؍؍	؍؍ (سورہ یونس)	؍؍	؍؍	جنوری	۸۵ء	ص ۵
؍؍	؍؍ (سورہ ہود)	؍؍	؍؍	فروری	؍؍	؍؍
الطاف علی قریشی	قرآن مجید کے حروف مقطعات	فکر و نظر	اسلام آباد	جولائی	۸۴ء	ص ۹۱
عمر احمد عثمانی، مولانا	تفسیر سورہ ذاریات	فیض الاسلام	راولپنڈی	نومبر	؍؍	ص ۱۲

"	"	"	"	دسمبر	"	ص ۱۳
علی عباس جلال پوری، سید	نادبنود	فنون	لاہور	ستمبر	۸۴ء	

فنون لطیفہ

علی عباس جلال پوری، سید	نادبنود	فنون	لاہور	ستمبر	۸۴ء	ص ۱۱۰
نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر	جدید سائنس اور اس کا مقصد وجود۔ اسلامی نقطۂ نظر سے	فکر و نظر	اسلام آباد	جولائی	"	ص ۷۷

احمد عثمانی، مولانا	تفسیر سورہ ذاریات	فیض الاسلام	راولپنڈی	جنوری	۸۵ء	ص ۱۱
فیض احمد، ملک	قرآن کریم اور ادبی محاسن	الہام	بہاول پور	۲۸ نومبر	۸۴ء	ص ۴
محمد تقی امینی، مولانا	قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت (۱۲)	حکمت قرآن	لاہور	جنوری	۸۵ء	ص ۴۸
" "	" " " (۱۲)	"	"	فروری	"	ص ۵۴
محمد محسن ٹونکی	محاکاتِ قرآنی	بینات	کراچی	جنوری	"	ص ۵۱
محمد یوسف لدھیانوی	تفسیر قرآن کے آداب	"	"	فروری	"	ص ۷
نور محمد غفاری	مولانا محمد غوث پشاوری کا مخطوطہ قرآن	"	"	جنوری	"	ص ۴۸

حدیث

احمد علی خان قاسمی	تحریری سرمایۂ حدیث۔ عہد نبوی اور عصر صحابہ میں	صدائے اسلام	پشاور	اگست	۸۴ء	ص ۲۱
حبیب احمد صدیقی	وضع حدیث کے محرکات پر کچھ معروضات	فاران	کراچی	اکتوبر	"	ص ۱۷
عبدالرشید عراقی	برصغیر پاک و ہند میں علم حدیث اور علمائے اہل حدیث کی مساعی	محدث	لاہور	جنوری	۸۵ء	ص ۴۰
محمد اسحاق، ڈاکٹر	تدوین حدیث	ترجمان الحدیث	"	اکتوبر	۸۴ء	ص ۱۵
" "	"	"	"	نومبر	"	ص ۲۷

سیرت نبوی

اطہر نعیمی، مولانا محمد	سید المرسلین صلعم	الہام	بہاول پور	۷ دسمبر	۸۴ء	ص ۵
اقبال رمانہ سیال، محمد	حبیب خدا آمنہ کی گود میں	الجامعہ	جھنگ	جنوری	۸۵ء	ص ۵۱
بلیغ الدین شاہ	قصیدہ بردہ شریف	ترجمان القرآن	لاہور	جنوری	"	ص ۱۱

ثاقب، رحیم الدین	رسول خدا اور انسانی حقوق	اظہار	کراچی	دسمبر	۸۴ء	ص ۱۰
جوہر دہلوی، سید احمد	رحمۃ اللعالمین	〃	〃	〃	〃	ص ۰
حبیب اللہ چشتی	تذکرہ حسن رسولؐ	الجامعہ	جھنگ	〃	〃	ص ۶۳
حبیب اللہ، مولانا	رحمتؐ دو عالم	〃	〃	فروری	۸۵ء	ص ۱۴
روبینہ ترین	حضورؐ کے چند خطبے	اظہار	کراچی	دسمبر	۸۴ء	ص ۳۳
سردار احمد قادری	وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین	الہام	بہاولپور	۷، 〃	〃	ص ۱۳
سعید اللہ، محمد	محسن انسانیتؐ	الجامعہ	جھنگ	دسمبر	〃	ص ۷۲
سعید الرحمٰن علوی، محمد	روح محمدیؐ کا پیغام	چٹان	لاہور	۲۶ نومبر	۸۴ء	ص ۹
شمیم یزدانی، چودھری برکت علی	رؤفؐ رحیمؐ	الجامعہ	جھنگ	دسمبر	〃	ص ۴۴
شہاب دہلوی	رحمت للعالمین ۔ ایک عظیم انقلاب کے داعی	الہام	بہاولپور	۷، 〃	〃	ص ۳
صلاح الدین، محمد	وانک لعلیٰ خلق عظیم	تکبیر	کراچی	۳۰ نومبر	〃	ص ۴
ضمیر اختر نقوی	اردو شاعری اور نعت رسولؐ	اظہار	〃	دسمبر	〃	ص ۳۸
طالب حسین رحمانی	رحمۃ اللعالمین	الجامعہ	جھنگ	〃	〃	ص ۷۶
ظہور احمد بروہی	اخلاق النبیؐ	〃	〃	جنوری	۸۵ء	ص ۶۰
عارف، عبدالمتین	فیضان کرم	اظہار	کراچی	دسمبر	۸۴ء	ص ۴۳
عازم القادری، محمد یوسف	مقام و احترام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	الہام	بہاولپور	۲۱، 〃	〃	ص ۲
عبدالرشید، میاں	جناب رسالت مآبؐ	الجامعہ	جھنگ	فروری	۸۵ء	ص ۲۶
عبدالستار، مولانا	ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم	الخیر	ملتان	〃	〃	ص ۱۵
عبدالمجید، ڈاکٹر میمن	ذکر حبیبؐ سندھ کے حوالے سے	اظہار	کراچی	دسمبر	۸۴ء	ص ۲۳
عفیفہ صوفیہ الحسینی	معراج النبیؐ	〃	〃	〃	〃	ص ۳۱
عقیل، سید غلام مصطفیٰ بخاری	بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش را	الجامعہ	جھنگ	〃	〃	ص ۴۹
غلام احمد حریری، پروفیسر	رسول اکرمؐ عملی پیغمبر کی حیثیت سے	〃	〃	〃	〃	ص ۱۳
غلام سرور، کرنل	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہ حیثیت سپہ سالار	تکبیر	کراچی	۲۸، 〃	〃	ص ۲۵
فدا محمد خان	رحمۃ اللعالمین بہ حیثیت سپہ سالار	تعمیر حیات	لکھنو	۱۰، 〃	〃	ص ۴
فیاض کاوش، پروفیسر	خلق محمدیؐ	الجامعہ	جھنگ	جنوری	۸۵ء	ص ۱۴
قمر الدین، صوفی	محسن انسانیتؐ	اظہار	کراچی	دسمبر	۸۴ء	ص ۲۵
محمد ایوب دہلوی، مولانا	سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم	فاران	〃	〃	〃	ص ۱۹

محمد تقی عثمانی	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز تعلیم و تربیت	الشمس	ملتان	۲۴ جنوری ۸۵ء	ص ۳
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃 〃	〃	〃	۲۵ فروری 〃	ص ۸
محمد حنیف جالندھری، مولانا	سیرتِ نبوی کا اجمالی مطالعہ	الخیر	〃	دسمبر ۸۴ء	ص ۴۳
محمد رفیق چودھری	سیرتِ نبوی قرآنی حکم کی روشنی میں	حکمتِ قرآن	لاہور	جنوری ۸۵ء	ص ۲۴
محمد صادق قصوری	عشقِ رسولؐ	الجامعہ	جھنگ	فروری 〃	ص ۵۳
محمد طیب، قاری	ختم نبوت ۔ سورۂ کوثر کی روشنی میں	صدقِ جدید	لکھنو	۲۸ دسمبر ۸۴ء	ص ۵
محمد یوسف	قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم	ترجمان القرآن	لاہور	دسمبر 〃	ص ۱۷
نذیر احمد، پروفیسر	آپؐ بہ حیثیت سپہ سالار اعظم	الجامعہ	جھنگ	جنوری ۸۵ء	ص ۴۴
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃	〃	فروری 〃	ص ۳۸
نور محمد پروفیسر	برکاتِ نورِ محمدی	〃	〃	جنوری 〃	ص ۱۰
ہارٹ، مائیکل ایچ	سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم	الشمس	ملتان	۱۳ء 〃	ص ۴
ہاشم رضا، سید	میرِ کارواں	اظہار	کراچی	ستمبر ۸۴ء	ض ۵
	سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں عزمِ علم کے لیے پیغام	الجامعہ	جھنگ	فروری ۸۵ء	ص ۷۴

فقہ۔ قوانین اسلامی

اسرار احمد، ڈاکٹر	قتلِ خطا میں نصف دیت کا مسئلہ	میثاق	لاہور	دسمبر ۸۴ء	ص ۵۷
جمیل احمد تھانوی، مفتی	عورت کی نصف دیت کا مسئلہ	الخیر	ملتان	نومبر 〃	ص ۹
حامد میاں، مولانا سید	مسئلہ رجم	میثاق	لاہور	دسمبر 〃	ص ۱۵
〃 〃 〃	〃 〃 〃	〃	〃	جنوری ۸۵ء	ص ۶۱
		〃	〃	فروری 〃	ص ۷۱
خالد مسعود، ڈاکٹر محمد	حج میں استطاعت کا مسئلہ	فکر و نظر	اسلام آباد	جولائی ۸۴ء	ص ۱۲۷
رفیع اللہ، مفتی محمد	حج کا تاریخی پس منظر	〃	〃	〃	ص ۱۰۷
ضیاالدین لاہوری	سعودی عرب میں رویت ہلال	بینات	کراچی	نومبر 〃	ص ۱۰
طاسین، مولانا محمد	مضاربت کی حقیقت اور شرعی حیثیت (۱)	حکمت قرآن	لاہور	〃 〃	ص ۴۹
〃 〃 〃	〃 〃 〃 (۲)	〃	〃	دسمبر 〃	ص ۶۰
〃 〃 〃	〃 〃 〃 (۳)	〃	〃	جنوری ۸۵ء	ص ۵۵
〃 〃 〃	〃 〃 〃 (۴)	〃	〃	فروری 〃	ص ۶۱
عبدالسلام کیلانی، مولانا	عورت کی دیت	ترجمان الحدیث	〃	دسمبر ۸۴ء	ص ۷

عبدالغفار حسن، مولانا	〃 〃 〃	الاعتصام	〃	۳۰ نومبر 〃	ص ۸
عبدالمجیب	اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر نو کا مسئلہ	محدث	〃	جنوری ۸۵ء	ص ۵
غلام الرحمٰن	قانون دیت و قصاص کے بعض زیر بحث نکات	الحق	اکوڑہ خٹک	اکتوبر ۸۴ء	ص ۴۳
فہیم عثمانی، مولانا محمد	عورت کی دیت کا مسئلہ	البلاغ	کراچی	نومبر 〃	ص ۳۳
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃	〃	دسمبر 〃	ص ۲۹
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃	〃	جنوری ۸۵ء	ص ۲۷
قمر احمد عثمانی	عورت کی دیت کا مسئلہ	فیض الاسلام	راولپنڈی	دسمبر ۸۴ء	ص ۲۱
محمد تقی عثمانی	رجم شرعی حد ہے	بینات	کراچی	فروری ۸۵ء	ص ۴۵
	تاریخ حج	قرآن الہدیٰ	〃	ستمبر ۸۴ء	ص ۵

مسائل مباحث

اسرار احمد، ڈاکٹر	ایمان اور اس کے ثمرات قرآن کی روشنی میں (۱)	حکمت قرآن	لاہور	نومبر	۸۴ء ص ۱۹
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃 (۲)	〃	〃	دسمبر	〃 ص ۲۵
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃 (۳)	〃	〃	جنوری	۸۵ء ص ۱۳
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃 (۴)	〃	〃	فروری	〃 ص ۱۱
〃 〃 〃	مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول۔ سورہ حجرات کی روشنی میں	〃	〃	جنوری	〃 ص ۱۹
جیب الحق ندوی، پروفیسر سید	اسلام اور مستشرقین	صدائے اسلام	پشاور	اگست	۸۴ء ص ۱۱
〃 〃 〃	〃 〃 〃 〃	〃	〃	دسمبر	〃 ص ۲۲
شہید مرتضیٰ مطہری	فلسفۂ شہادت	رضاکار	لاہور	۸ جنوری	۸۵ء ص ۶
صلاح الدین، محمد	نفاذ اسلام کنونشن۔ تجاویز و سفارشات کے آئینے میں اعادے کی مشق	تکبیر	کراچی	۸ فروری	〃 ص ۸
عبدالہادی	مادہ پرستانہ سائنس کی گواہی	ترجمان القرآن	لاہور	جنوری	〃 ص ۴۸
عفیفی، ابوالعلا	متصوفانہ فلسفہ ابن العربی	اردو	کراچی	جولائی	۸۴ء ص ۱۶۰
〃 〃	〃 〃 〃 (آخری قسط)	〃	〃	اکتوبر	〃 ص ۱۳۵
غلام محمد	مسلک سلیمانی	برہان	دہلی	دسمبر	〃 ص ۲۹
فیض احمد اویسی، محمد	فضل الرب فی حسن الادب (مسلسل)	الہام	بہاول پور	۲۱ جنوری	۸۵ء ص ۲
محمد مسعود، ڈاکٹر	اسلام صرف اسلام ہے	انصاف	راولپنڈی	۱۵ 〃	〃 ص ۴
ن۔ ط بنت محمد محمد حیات خاں	حیات انبیا	بینات	کراچی	جنوری	〃 ص ۳۹
یوسف سلیم چشتی، پروفیسر	اسلام کو حکمائے عصر کے تین چیلنج	حکمت قرآن	لاہور	دسمبر	۸۴ء ص ۴۳
〃 〃 〃	فکر مغرب کی اساس اور اس کا تاریخی پس منظر	〃	〃	فروری	۸۵ء ص ۲۴

انطنی کلوبطرہ

ولیم شکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے کا منظوم و مقفیٰ ترجمہ

مترجم: شانہ الحق حقی

صفحات: ۴۸۸ — قیمت: ۷۰ روپے

لولوے ارغیب

مصنفہ: شیولال۔ مرتبہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری

قیمت: چھ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

مفکرینِ اسلام

مصنفہ

مولانا عبید اللہ قدسی

صفحات: ۱۶۳ — قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بابائے اردو روڈ کراچی ۱

Regd. S. No. 1138
Monthly

QAUMI ZABAN

Phone : 217137
Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

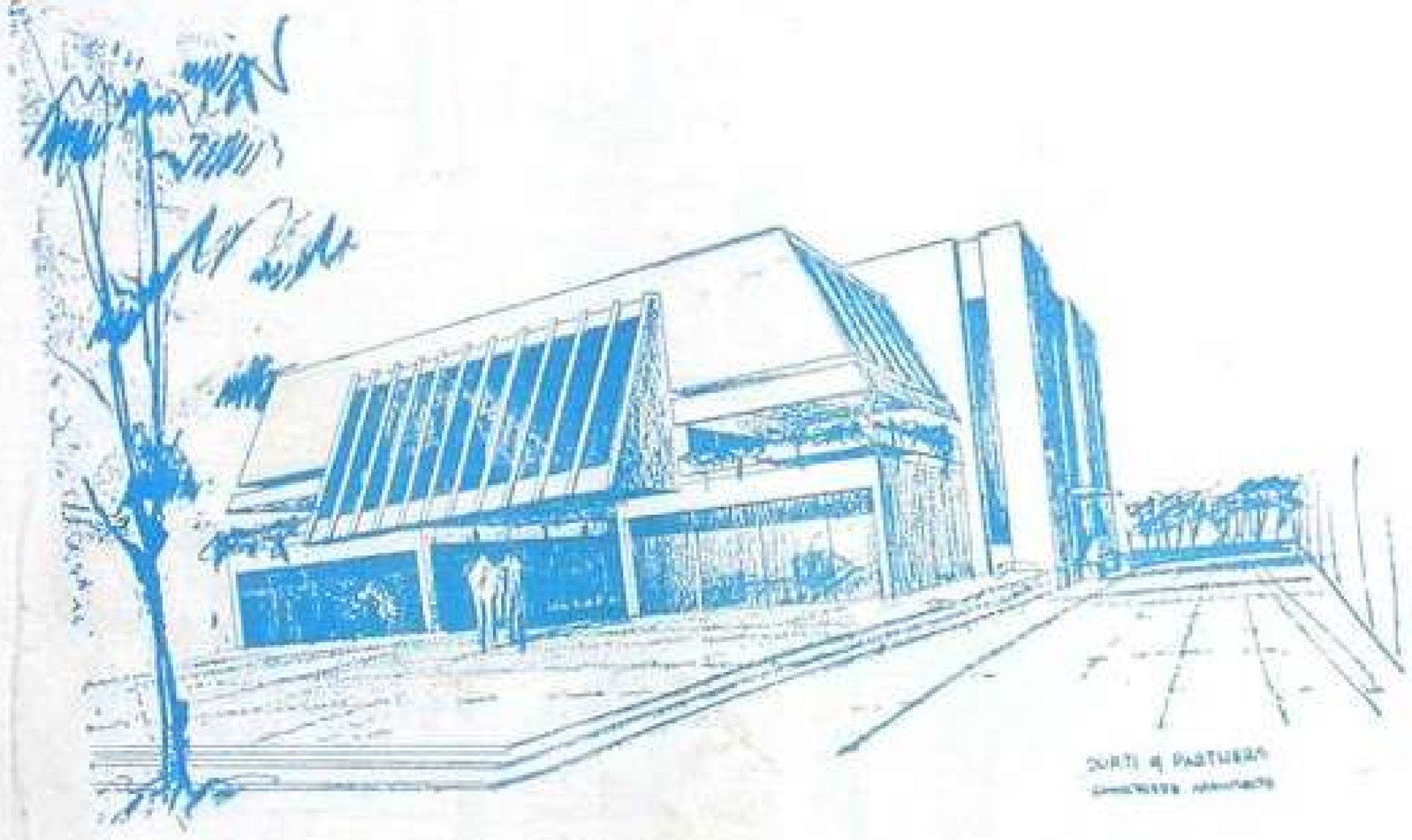

ایک خواب
جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر :- ادیب سہیل کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر
انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا -